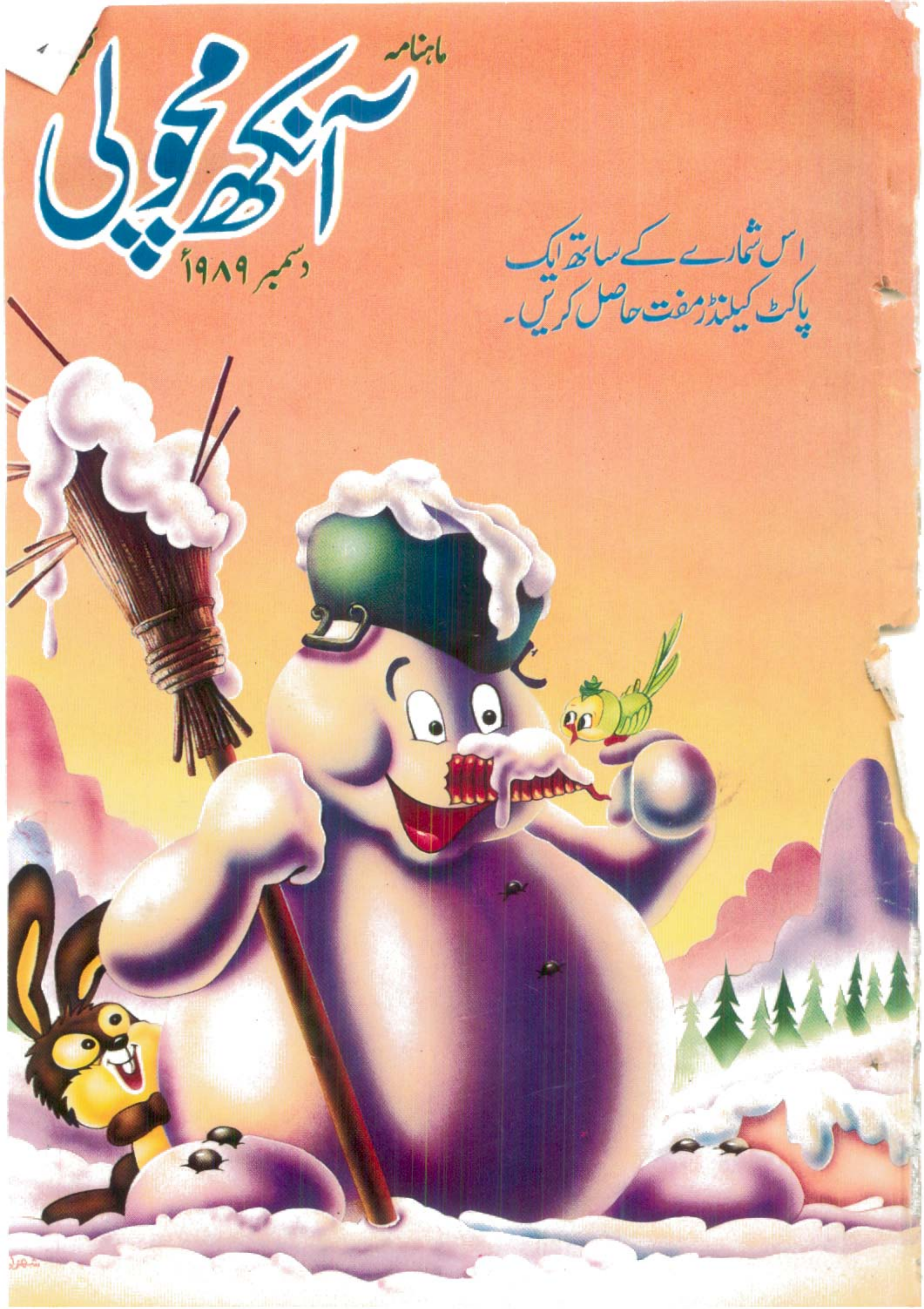
ماہنامہ
آنکھ مچولی
دسمبر ۱۹۸۹ء
اس شمارے کے ساتھ ایک
پاکٹ کیلنڈر مفت حاصل کریں۔

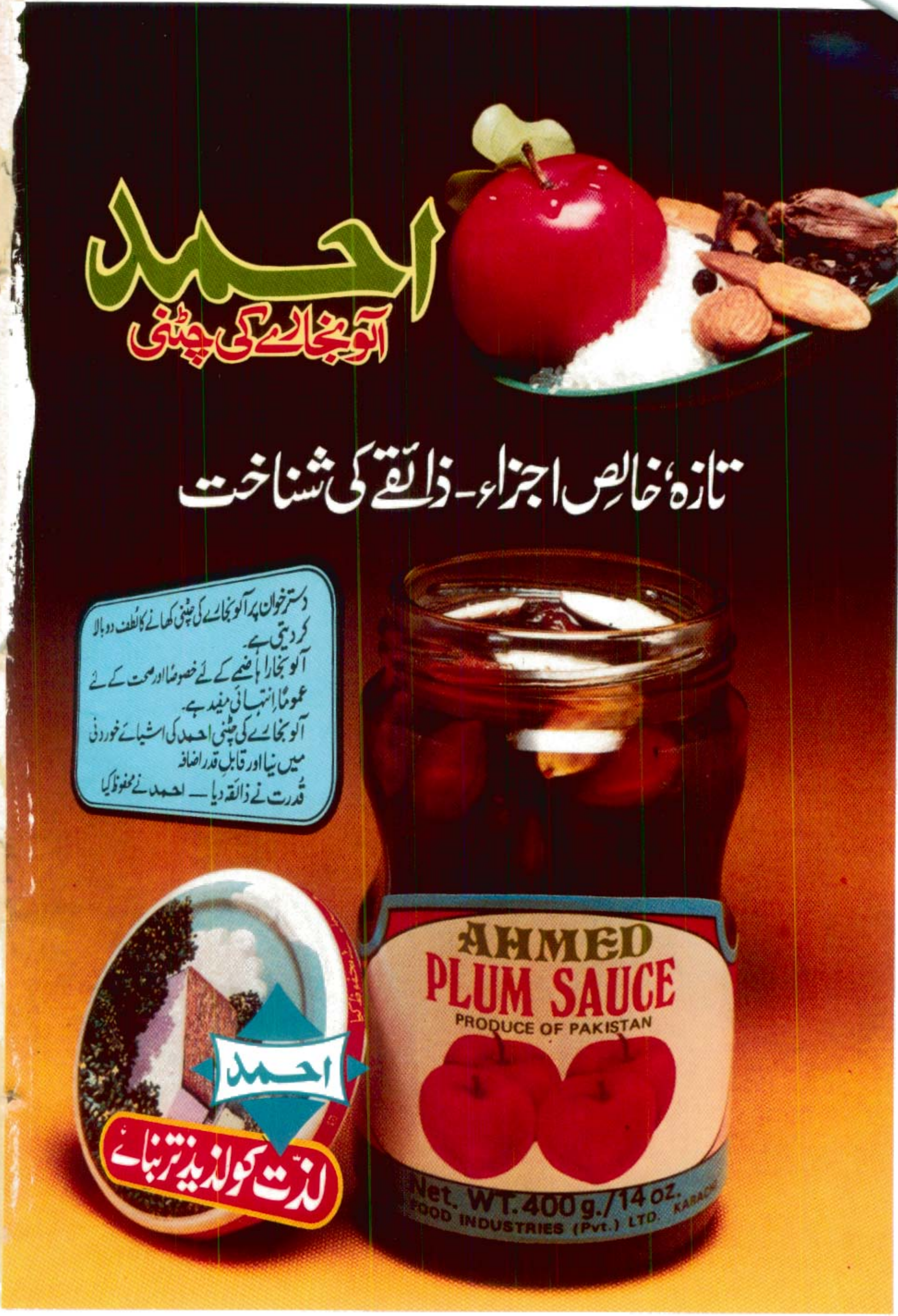

احمد
آلو بخارے کی چٹنی
تازہ، خالص اجزاء۔ ذائقے کی شناخت
دسترخوان پر آلو بخارے کی چٹنی کھانے کا لطف دوبالا کر دیتی ہے۔
آلو بخارا ہاضمے کے لئے خصوصاً اور صحت کے لئے عموماً انتہائی مفید ہے۔
آلو بخارے کی چٹنی احمد کی اشیائے خوردنی میں نیا اور قابلِ قدر اضافہ
قدرت نے ذائقہ دیا — احمد نے محفوظ کیا
AHMED
PLUM SAUCE
PRODUCE OF PAKISTAN
Net. WT. 400 g./14 oz.
FOOD INDUSTRIES (Pvt.) LTD.
احمد
لذت کو لذیذ تر بنائے

ABC آڈٹ بیورو آف سرکولیشن سے تصدیق شدہ اشاعت
رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی

نئی نسل کے ادب کا بین الاقوامی معیار

آنکھ مچولی

مُدیرِ اعلیٰ ظفر محمود شیخ

مُدیر مسئول تجمل حسین چشتی

مُشاورت مُشفق خواجہ، امجد اسلام امجد

مُدیرانِ اِعزازی طاہر مسعود، محمد سلیم مغل

مجلسِ ادارت شاہ نواز فاروقی، سید خورشید عالم

خطّاطی عارف سعید

فون نمبر - ۲۹۹۱۷۸

● ماہنامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی تمام تحریروں کے جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ پیشگی اجازت کے بغیر کوئی تحریر شائع نہیں کی جاسکتی۔

● ماہنامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی قرآن وحدیث پر مبنی تحریروں کے علاوہ کہانیوں کے کردار و واقعات فرضی ہیں۔ کسی اتفاقیہ مماثلت کی صورت میں ادارہ ذمہ دار نہ ہوگا۔

● ماہنامہ آنکھ مچولی کو گرین گائیڈ اکیڈمی نے ضمیر الدین میموریل آرگنائزیشن کے زیرِ سرپرستی بچوں کی ذہنی اور علمی صلاحیتوں میں اضافے اور سیرت و کردار کی تعمیر کے لیے شائع کیا۔

جلد ۴ شمارہ ۶ دسمبر ۱۹۸۹ء جمادی الاول ۱۴۱۰ھ

ناشر: ظفر محمود شیخ طابع: زاہد علی مطبع: لاریب پرنٹنگ پریس، ایم اے جناح روڈ۔ کراچی
خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ آنکھ مچولی، گرین گائیڈ اکیڈمی، ۱۱۲۔ڈی، نورس روڈ، سائٹ کراچی

قیمت ۱۰ روپے، ۷ درہم، ۷ ریال
زرِ سالانہ کے لیے خصوصی بچت اسکیم کا صفحہ دیکھیے

خصوصی بچت اسکیم

آنکھ مچولی کے ۱۲ شمارے
کتنے سستے کتنے پیارے

دسمبر ۱۹۸۹ء سے
قبل ممبر شپ حاصل کرنے
والوں کے لیئے مہمّاتی
کہانیوں کی خوبصورت
کتاب "حق اسکواڈ" کا
تحفہ بالکل مُفت

۵۰ روپے کی
خصوصی رعایت اور
تحفہ مفت

آنکھ مچولی کے بارہ شماروں کی قیمت
مع دو خاص شمارے اور رجسٹرڈ ڈاک خرچ
۲۱۰ روپے بنتی ہے، لیکن سالانہ ممبر شپ حاصل کرنے والوں کے لیے خصوصی
رعایت یعنی ۲۱۰ کے بجائے صرف **۱۵۰** روپے۔ اس طرح گویا
مالی منفعت بھی اور علمی فائدہ بھی

آنکھ مچولی بیرون مُلک منگوانے کے لئے زرِ سالانہ مُبلغ ۳۰۰/= روپے

رسالہ سال بھر تک منگوانے کے لئے دو طریقوں میں سے جسے مناسب اور احسن سمجھیں اختیار کریں۔

(۱) زرِ سالانہ کی رقم دفتر کے پتے پر منی آرڈر کریں اور کوپن پُر کر کے ہمیں بھجوا دیں **یا**

(۲) ۱۰ روپے کے ڈاک ٹکٹ اور صرف کوپن پُر کر کے ہمیں بھجوا دیں۔ ہم آپ کو پہلا رسالہ (وی پی) بھجوا دیں گے۔
آپ ۱۴۰ روپے کے عوض وی پی چھڑوالیں (کوپن صفحہ نمبر ۱۱۱ پر موجود ہے)

سالانہ ممبر شپ آنکھ مچولی ۱۱۲۔ ڈی سائٹ کراچی

حسنِ ترتیب

عنوان	مصنف	صفحہ
تاریخ کے دریچے سے		۶
خمیازہ	عمران مشتاق	۴۳
ماں (نظم)	شاہنواز فاروقی	۷۹
ابنِ بطوطہ اور ابنِ بطوطی	انٹرویو۔ محمد سلیم مغل	۱۱۳
پاکستان	صوفی غلام مصطفےٰ تبسم	۹
دھاڑیل	نعیم بوبیو	۴۶
وہ واپس آئیں گے	طاہر مسعود	۸۱
منتخب کارٹون		۱۲۱
مقابلۂ خطاطی	نتائج	۸۷
آدم خور شیر	سید عرفان علی یوسف	۱۲۳
ڈاکیا ڈاک لایا		۱۱
زمین کی قوتیں	شین فاروقی	۵۳
تاریخی کہانی		۱۶
پاپوش نگر	ابنِ شہباز خان	۵۹
انجانی مہم	علی رضا عابدی	۹۱
صبا اور پنکی	ذیشان بن صفدر	۱۳۴
کار چلانے والا گھوڑا	سمعی سلیم	۲۲
کھٹے میٹھے	منتخب لطائف	۶۳
بکری (نظم)	محمد جاوید خالد	۹۸
انسان اور کیڑے	غلام مصطفےٰ سولنگی	۱۳۹
ایک سال اور	سلمان غزالی	۲۵
بھونچال (نظم)	شبیر بیگ ناز	۶۷
چنڈال چوکڑی	ایم شہزاد احمد	۹۹
گُنی چُنی معلومات	سید عقیل عباس جعفری	۱۴۳
دیوارِ برلن سے آخری فرار	ابن عالم	۱۰۳
ننھی نگارشات		۱۴۸
سائنس انکوائری	سید ایاز محمود	۲۹
اگر آگ لگ جائے تو	نیرّ ابدالی	۶۸
کیٹی تم کہاں ہو؟	سید خورشید عالم	۳۵
نافرمانی کی تصویر	محمد افتخار کھوکھر	۷۱
جُستجو شرط ہے	اسامہ بن سلیم	۱۰۷
سالگرہ کے ساتھی	قلمی دوستی	۱۶۰
کوپن کا صفحہ		۱۱۱
امی ابو کا صفحہ	ام رمیصا	۱۶۳
کتے بھی کھیلتے ہیں	حارث شمیم	۴۰
اجنبی دوست	فرحین نگار	۷۵

تاریخ کے دریچے سے

ابتدا میں قائدِ اعظمؒ کو اسکول جانے سے بالکل دلچسپی نہیں تھی۔ ایک دن قائدِ اعظمؒ نے اپنے والد سے کہا۔

"ابّا جان مجھے اسکول جانا اچھا نہیں لگتا۔"

"پھر تم کیا کرنا چاہتے ہو؟" والد نے پوچھا

"ابّا جان میں آپ کے ساتھ بیٹھ کر کاروبار سیکھنا چاہتا ہوں۔"

"مگر ابھی تم اس کے لئے بہت چھوٹے ہو محمّد علی۔"

"میں آپ کے دفتر میں بیٹھ کر اسکول کی نسبت زیادہ بہتر کام کروں گا۔" قائدِ اعظمؒ نے جواب دیا۔ والد نے بہت سمجھایا، مگر وہ نہ مانے۔ جس کے بعد والد نے اُنہیں اپنے دفتر میں کام کرنے کی اجازت دے دی۔ لیکن دو ماہ کے اندر ہی وہ دفتر کے کام سے اُکتا گئے۔ اور ایک روز انہوں نے والد سے کہا۔

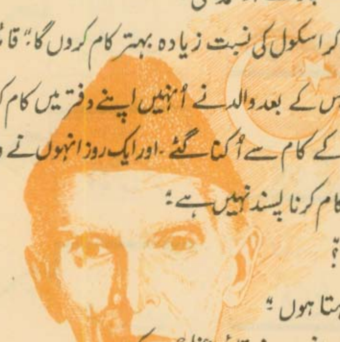

"ابّا جان۔ مجھے دفتر میں کام کرنا پسند نہیں ہے۔"

"پھر تم کیا کروگے محمّد علی؟"

"میں واپس اسکول جانا چاہتا ہوں۔"

والد بہت خوش ہوئے لیکن انہوں نے قائدِ اعظمؒ سے کہا۔

"دیکھو بیٹا! زندگی کو سمجھنے کے دو ہی راستے ہیں۔"

"ابّا جان وہ کون کون سے ہیں؟"

"ایک یہ کہ آپ اپنے بزرگوں کی دانش اور تجربے پر بھروسہ کریں۔ ان کی نصیحت قبول کریں اور ان کے مشورے کے عین مطابق عمل کریں۔"

"اور دوسرا راستہ کون سا ہے ابّا جان؟"

"دوسرا طریقہ یہ ہے کہ آپ خود اپنے راستے پر چلیں اور غلطیاں کرکے ان سے سبق سیکھیں اور زندگی کی شدید اور تکلیف دہ ٹھوکروں اور مشکلات سے زندگی کو سیکھیں اور سمجھیں۔" قائدِ اعظمؒ نے اپنے والد کی باتوں کو پوری توجہ سے سُنا اور پھر طے کر لیا کہ وہ زندگی کے خارزار راستوں میں سے اپنا راستہ خود چُنیں گے۔ قائدِ اعظمؒ نے نہایت خود اعتمادی کے ساتھ اپنا راستہ خود چُنا اور پھر اُنہیں اس راستے سے دُنیا کی کوئی طاقت نہ ہٹا سکی اور اسی راستے پر چل کر انہوں نے پاکستان بنایا۔ (از "میرا بھائی" مصنّفہ محترمہ فاطمہ جناحؒ)

ماہِ رواں کی پہلی بات

پاکستان ٹیلی وژن کو اپنی نشریات پیش کرتے ہوئے پچیس سال ہو گئے۔ ان پچیس برسوں میں ایک ایسی نسل جوان ہوئی، جس کے کردار، سوچ اور عمل کو بنانے یا بگاڑنے میں اگر سب سے زیادہ کسی کا حصہ رہا ہے تو بلاشبہ وہ ٹیلی وژن ہی ہے۔ کیونکہ یہ نسل والدین اور اساتذہ کے اثرات کو اتنی آسانی سے قبول نہیں کرتی، جتنے ٹیلی وژن کے پروگراموں کے اثرات کو وہ اپنے اندر جذب کرتی ہے۔ بغیر کسی بحث و مباحثے کے اور بغیر کسی مزاحمت کے، شاید اسی لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ ٹیلی وژن کو چلانے والے اور اس کی پالیسیاں بنانے والے لوگ اپنے ناظرین کو صرف پچھلے پچیس سال کے پروگراموں کی جھلکیاں ہی دیکھنے اور دکھانے پر بس نہ کریں بلکہ اس کا بھی جائزہ لیں کہ ٹیلی وژن نے نئی نسل پر کیا اثرات مرتب کیے اور یہ کہ وہ آئندہ اس سلسلے میں اپنے کردار کو زیادہ بہتر طریقے سے کس طرح ادا کر سکتا ہے۔

اس حقیقت سے خود ٹیلی وژن انتظامیہ کو بھی انکار نہ ہوگا کہ اتنے طویل عرصے کے دوران ٹیلی وژن نے ایک نئی ثقافت کی راہ ہموار کی ہے اور اس ثقافت میں عام طور پر تفریح کو ہی بنیادی اہمیت دی جاتی ہے۔ پاکستان ٹیلی وژن ایک ایسا دروازہ بن گیا ہے جہاں سے مغربی تہذیب و تمدن ہمارے معاشرے میں داخل ہو کر نئی نسل کی زندگی میں رچ بس رہا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہم آج کی دنیا اور اس کے اثرات سے خود کو محفوظ نہیں رکھ سکتے۔ لیکن اپنے دین اور اپنی تہذیب و ثقافت سے یکسر بے گانگی بھی اچھی نہیں۔ بے شمار موضوعات اور مسائل ایسے ہیں جن پر پروگرام پیش کر کے ٹیلی وژن ایک اہم قومی خدمت انجام دے سکتا ہے۔ مثلاً ان میں سے چند ایک درج ذیل ہیں۔

- ۱۔ بچوں کی دینی تربیت کے سلسلے میں ٹیلی وژن کو اپنے پروگراموں کا دائرہ وسیع کرنا چاہئے۔ دین کی بنیادی تعلیمات اور اس کی اہمیت پر بہت دلچسپ اور اچھے پروگرام پیش کئے جا سکتے ہیں۔ جس کی طرف اب تک خاطر خواہ

توجہ نہیں دی گئی ہے۔

● ۲۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ٹیلی وژن نے موسیقی کے پروگراموں کے ذریعے بہت دلکش ملی نغمے پیش کئے ہیں لیکن ان نغموں سے صرف یہ تاثر ابھرتا ہے کہ پاکستان پہاڑوں، دریاؤں، جھیلوں اور حسین سبزہ زاروں کا ایک ملک ہے۔ پاکستان کسی نظریئے کی بنیاد پر وجود میں آیا ہے اور وہ ایک خاص عقیدہ رکھنے والے لوگوں کا ملک ہے۔ یہ بات ان نغموں کے ذریعے کبھی اجاگر نہیں کی گئی۔ لہٰذا ہمارا ٹیلی وژن ملک کی نظریاتی اساس کو نئی نسل کے ذہنوں میں مضبوط کرنے میں ناکام رہا ہے اور یہی وجہ ہے کہ آج کی نوجوان نسل ہمیں سب سے زیادہ صوبائی اور علاقائی تعصبیت کا شکار نظر آتی ہے۔

● ۳۔ ٹیلی وژن کو تحریکِ پاکستان کی تاریخ اور تحریکِ آزادی کی شخصیات پر پروگرام نئی نسل کی دلچسپی کو سامنے رکھتے ہوئے پیش کرنے چاہئیں۔

● ۴۔ بچّوں کی تربیت کے سلسلے میں والدین کی رہنمائی کرنے والے پروگرام تیار کئے جانے چاہئیں۔

● ۵۔ ہمارے آج کے بچّوں کے بے شمار نفسیاتی تعلیمی اور جذباتی مسائل ہیں۔ ان مسائل پر ایسے پروگرام پیش کئے جائیں جنہیں دیکھ کر ہماری نئی نسل میں خود اپنے مسائل کا شعور پیدا ہو اور وہ اُسے حل کر سکیں۔ خاص طور پر ایسے پروگرام جس سے ان میں بے مقصدیت کا احساس ختم ہو اور وہ ایک بامقصد زندگی گزارنے کے قابل ہوسکیں۔

● ۶۔ ملک میں لاکھوں بچّے محنت کش ہیں یا پھر تعلیم سے محروم ہو کر جرائم پیشہ بن چکے ہیں۔ ٹیلی وژن کو معاشرے کی توجہ ان بچّوں کے حالات بہتر بنانے کی جانب مبذول کرانی چاہیئے۔ کیونکہ یہ مسئلہ صرف حکومت کے حل کرنے کا نہیں۔۔۔

ہمیں امید ہے کہ ٹیلی وژن کے اربابِ اختیار ہماری ان گزارشات پر غور فرمائیں گے۔

آپ کا دوست
ظفر محمود شیخ

کیا آپ ہمیں کُتب کا آرڈر دے چکے ہیں؟

اگر آپ ادارۂ گرین گائیڈ اکیڈمی کو تعلیم الاسلام یا دیگر کتب منگوانے کے لئے آرڈر دے چکے ہیں اور ابھی تک یہ کتب آپ تک نہیں پہنچیں تو اطمینان رکھیں کہ تعلیم الاسلام کے نئے حسین ایڈیشن کی طباعت کے فوراً بعد آپ کی کتب (دسمبر کے آخر تک) آپ کو بھجوا دی جائیں گی۔ انشاءاللہ۔

اقبالؒ کا خواب

پاکستان

صوفی غلام مصطفیٰ تبسم

کتنا اچھا ہے کتنا پیارا ہے   اِک چمکتا ہُوا ستارا ہے
ہم ہیں اس کے تو یہ ہمارا ہے   جان میں اُس کی جان ہے اپنی
اُس کی ہر شان شان ہے اپنی

یہ بڑا ملک ہے کہ چھوٹا ہے   اُس طرح کا کہ اِس طرح کا ہے
یہ بڑی بات ہے کہ اپنا ہے   دیس میں اپنے اپنا راج تو ہے
اپنے ہاتھوں میں اپنی لاج تو ہے

کِس نے پہلے پہل یہ بات بتائی   کِس نے پہلے پہل یہ راہ دکھائی
کس نے خوشخبری ہم کو آکے سنائی   جانتے ہو یہ کام کِس کا تھا
ڈاکٹر اقبال نام جس کا تھا

چاہتے ہو کہ تم بھی ہو آباد   چاہتے ہو کہ تم بھی ہو آزاد
چاہتے ہو کہ تم بھی ہو دلشاد   ایک نئی دنیا بسا لو تم
ایک جنّت یہیں بنا لو تم

یہ چمن، یہ بہار اُسی کی ہے   یہ وطن یادگار اُسی کی ہے
سب کہو بار بار اُسی کی ہے   سب کہو زندہ باد پاکستان
زندہ، پائندہ باد پاکستان

اچھی کتابیں

سرمایۂ حیات بھی رفیقِ زندگی بھی

طالبان
علم وادب کے لئے
گرین گائیڈ اکیڈمی کی شائع کردہ
نادر اور حسین کتابیں اب انتہائی خصوصی رعایت کے ساتھ دستیاب ہیں

اس پیشکش کا آج ہی فائدہ اُٹھایئے

یہ کتب آپ کے علمی خزانے میں گرانقدر اضافہ ہوں گی۔

	موجودہ قیمت مع ڈاک خرچ	بعد از رعایت مع ڈاک خرچ
۱ سب سے بڑا انسان ﷺ ۔ سیرت طیبہ پر سید [illegible] کی اہم تصنیف صدارتی ایوارڈ یافتہ ڈی لکس ایڈیشن	۴۰ روپے	۲۵ روپے
۲ راہ نما قرآنی حکایات کا دلچسپ مجموعہ	۱۰ روپے	۸ روپے
۳ سفر مبارک حجاز مقدس کا سفر نامہ بھی راہنما بھی	—	صرف ڈاک خرچ ۴ روپے
۴ تعلیم الاسلام ۴ حصوں پر مشتمل اسلام کی بنیادی تعلیمات	—	صرف ڈاک خرچ ۴ روپے
۵ حق اسکواڈ مہماتی کہانیوں کا سنسنی خیز مجموعہ	۱۰ روپے	۸ روپے
۶ کہنا بڑوں کا مانو تعمیر سیرت اطفال کے لئے خوبصورت	۴ روپے	۳ روپے

آپ صرف ۵۰ روپے بھجوا کر تمام کُتب یکمشت بھی منگوا سکتے ہیں

پتا:۔ گرین گائیڈ اکیڈمی۔ ۱۱۲۔ ڈی سائیٹ کراچی نمبر ۱۶۔ فون نمبر ۲۹۹۱۷۸

محبوب گل یاسر۔ تنگی برہ زئی۔ ضلع چارسدہ۔: کیا بات ہے انکل! آپ کے پاس صحافی بہت کم ہیں کہ انٹرویو اتنی تھوڑی تعداد میں شائع ہوتے ہیں۔ اگر ایسی بات ہے تو میری خدمات حاضر ہیں۔

● محبوب میاں! صحافی کم نہیں ہیں۔ وہ لوگ بہت کم ہیں جن کے انٹرویو لیئے جاسکیں۔ اگر آپ کسی ایسی شخصیت کو تلاش کرکے انٹرویو لے سکیں تو ہمیں مسرت ہوگی۔

صالح محمد ضیاء۔ شاہ فیصل کالونی کراچی۔: خوفناک نمبر آنے سے پہلے ہی آپ نے خوفناک سا سرورق نومبر کے مہینے میں چھاپ دیا اور یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ سرورق سے آپ نے کیا تاثر دینا چاہا ہے

● آپ کو پتا ہے کہ آج کل کتنے زبردست طریقے سے ڈکیتیاں ہو رہی ہیں۔ خبریں پڑھ پڑھ کر ذہنوں میں ڈاکوؤں کا خوف سما گیا ہے۔ بس اسی ایک تاثر کو ہم نے اپنے سرورق میں پیش کیا تھا۔ آپ کو پسند نہیں آیا؟

حبیب جمیل قریشی۔ سیالکوٹ۔: آپ نے اسکالرشپ میں انعام حاصل کرنے کے لئے اپنے اسکول یا کالج کا شناختی کارڈ لازمی قرار دیا ہے۔ اب جو بچے غریب ہونے کی وجہ سے اسکول میں داخلہ نہیں لے سکتے اور پرائیویٹ تعلیم حاصل کر رہے ہیں کیا ان کا اس رسالے پر کوئی حق نہیں ہے۔ امید ہے آپ یہ شرط ختم کر دیں گے۔

● آپ کا اعتراض معقول ہے۔ پرائیویٹ تعلیم حاصل کرنے والے بچے اپنے رجسٹریشن کارڈ کی نقل بھیج کر اس اسکیم میں حصہ لے سکتے ہیں۔ یہ بات ذہن میں رہے کہ یہ اسکیم صرف طلباء ہی کے لئے شروع کی گئی ہے۔

وحید علی بنگش۔ ملٹری کالج۔ جہلم۔: بھائی جان۔ آپ اپنے اس پیارے سے رسالے میں ذرا سنجیدہ اور سبق آموز کہانیوں کو زیادہ جگہ دیں۔ سیف گیمز کے بارے میں جو معلومات رسالے میں دی گئی تھیں۔ وہ ہمارے جنرل نالج کے ٹیسٹ میں بہت کام آئی آپ کا شکریہ!

ڈاکیا ڈاک لایا

● بھائی۔ ہماری کہانیاں سبق آموز ہی ہوتی ہیں۔ لیکن کہانی کو پہلے تو کہانی ہی ہونا چاہئے۔ کیونکہ اگر اس میں دلچسپی نہیں ہوگی تو کوئی اُس سے سبق بھی حاصل نہیں کرے گا۔ اور ہاں۔ اس میں شکریے کی کیا بات ہے ؟

ثمینہ علی۔ امجد علی۔ شاریہ۔ متسیر علی (؟) ہم لوگ تین سال سے آنکھ مچولی پڑھ رہے تھے لیکن اب پیسوں کی وجہ سے پڑھنا چھوڑ دیا ہے۔ نومبر کے شمارے میں قسطوار کہانی دھاڑیل پسند آئی۔ بھلا خوفناک نمبر کی قیمت کیا ہوگی؟

● اگر آنکھ مچولی پڑھنا آپ لوگوں نے چھوڑ دیا ہے تو دھاڑیل آپ نے کیسے پڑھ لی؟ پڑھنے پر اگر کچھ پیسے خرچ ہو جائیں تو پریشان نہیں ہونا چاہیئے۔ خوفناک نمبر کی قیمت اتنی ہی ہوگی۔ جتنی پچھلے نمبروں کی ہوتی تھی۔

حبیب الرحمٰن۔ کراچی۔ اس سے پہلے پانچ خط تفصیل سے لکھ چکا ہوں جس میں کئی باتیں اور مشورے تحریر کئے تھے لیکن ہر دفعہ خط کی شمولیت نہ ہوسکی۔ ہمارے ڈاک ٹکٹ بھی ضائع ہوئے۔ کیا اسی طرح آپ نقصان کراتے رہیں گے؟

● میرے دوست! آپ کے پانچوں خط اگر ملے ہیں تو ان میں کوئی بات ایسی نہیں رہی ہوگی جس کا جواب دیا جانا ضروری ہو۔ اب اسی خط میں دیکھئے کہ آپ نے صرف ایک ہی بات پوچھی ہے جس کا جواب یہ ہے کہ خوفناک نمبر کے لئے آپ کسی بھی کتاب سے کسی تحریر کا اقتباس بھیج سکتے ہیں۔

شوکت جاوید۔ کیماڑی۔ کراچی۔ میری تجویز یہ ہے کہ آپ اپنے قارئین کو وطنِ عزیز پاکستان پر مضامین لکھنے کی دعوت دیں اور لکھنے والوں سے کہیں کہ وہ اس ملک سے اپنی محبت کا اظہار کریں اور اس ملک کے سلسلے میں اپنے جذبات و احساسات کو پیش کریں تاکہ معلوم ہوسکے کہ انہیں اپنے وطن سے کتنی محبت ہے۔

● آپ کی جذبۂ حُبُّ الوطنی سے بھرپور تجویز پسند آئی۔ وطنِ عزیز کے حوالے سے ہم نظمیں کہانیاں اور مضامین تو پہلے ہی چھاپتے رہتے ہیں۔ اب اس پہلو پر بھی غور کریں گے۔

پرنس ممتاز احمد قریشی۔ مکلی۔ ٹھٹھہ۔ اس بار مجھے آنکھ مچولی کا سرورق اچھا نہیں لگا۔ کیونکہ اس میں کلاشنکوف کی تصویریں تھیں۔ ہم پہلے ہی اس سے تنگ آچکے ہیں۔ روز اخباروں میں اس کی تصویریں دیکھتے ہیں۔ اس کا ذکر سُنتے ہیں۔ دیواروں تک پر اس کی تصویریں بنی ہوتی ہیں۔ کم از کم بچّوں کے رسالوں کو تو اس سے محفوظ ہونا چاہئے۔ ہاں آپ نے سگریٹ نوشی کے خلاف جو جہاد شروع کیا ہے۔ اس میں ہم آپ کے ساتھ ہیں۔

● مائی ڈیئر پرنس! آپ نے جو صورتِ حال بیان کی ہے۔ ہم نے اُسی صورتِ حال کو اپنے سرورق پر پیش کیا تھا تاکہ حکومت کی توجّہ اس تشویش ناک مسئلے کی طرف مبذول کرائی جاسکے۔ ہماری نیت نیک تھی۔ سگریٹ نوشی کے خلاف جہاد میں آپ سب کے تعاون کی ضرورت ہے۔

سید نوید احمد۔ لیاقت آباد۔ کراچی۔ برائے مہربانی آنکھ مچولی کے دو صفحات "ذہن کی کاوش" کے لئے مخصوص کر دیجئے۔ اس سے بچّوں کی تحریری صلاحیت کا اندازہ ہو سکے گا۔ اس سلسلے میں میں تین مثالیں آپ کو بھیج رہا ہوں۔

● "ذہن کی کاوش" کی تجویز پر غور کرنے کے لئے ہم نے اپنی تمام ذہنی صلاحیتیں لڑادیں لیکن آپ کی تجویز کچھ سمجھ میں نہیں آسکی۔ اگر ممکن ہو تو ذرا وضاحت سے لکھئے کہ آپ کی یہ تجویز دراصل ہے کیا۔

الحاج شاھد نذیر۔ سیالکوٹ ،۔ آپ اپنے رسالے میں بچّوں کے لیئے الیکٹرونکس کے آسان تجربوں کے لیئے پروجیکٹس دینا شروع کیجئے۔ اس سے بچّوں میں کام کرنے کا شوق پیدا ہوگا۔

● تجویز تو آپ کی اچھی ہے اور کیا ہی اچھا ہوتا کہ آپ خود ان پروجیکٹس کی تفصیلی تجاویز تیار کرکے ہمیں ارسال کردیتے۔

محمد فیصل۔ سندھی ھوٹل، کراچی ،۔ جب آپ ماہ رواں کی پہلی بات کا آغاز کیا کریں تو شروع میں السلام علیکم ضرور لکھیں۔ امید ہے آپ اس پر عمل کریں گے۔ اور یہ بھی بتادیں کہ خوفناک نمبر کی قیمت کتنی ہوگی؟

● ماہ رواں کی پہلی بات کا آغاز ہمیشہ اللہ کے بابرکت نام سے ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اداریے میں ہر ماہ کسی نہ کسی مسئلے یا موضوع پر گفتگو ہوتی ہے۔ اگر اداریہ، پڑھنے والوں کے نام کسی خط کی صورت میں لکھا جاتا پھر تو سلام کرنا ضروری تھا۔ لیکن موجودہ صورت میں اس کی ضرورت نہیں۔ رہی بات خوفناک نمبر کی قیمت کی تو یہ اتنی ہی ہوگی جتنی پچھلے خوفناک نمبر کی تھی۔

ذکاءالدین۔ رسالپور کینٹ ،۔ بھائی جان! آپ نے جو سگریٹ چھوڑ تحریک چلائی ہے۔ کیا اس سے سگریٹ پینے والے سگریٹ پینا چھوڑدیں گے؟ دوسرے یہ کہ مجھے وزارتِ صحت اسلام آباد کا پتا عنایت فرمادیجئے۔ تاکہ میں خط لکھ سکوں۔

● جب کوئی تحریک چلائی جاتی ہے تو اس میں کامیابی کی توقع لازماً ہوتی ہے۔ ورنہ تحریکیں چلائی ہی کیوں جائیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہماری مہم سے سگریٹ نوشی کا خاتمہ تو نہیں ہوسکے گا لیکن ایک فیصد تو چھوڑ دیئے، ایک شخص سے بھی اگر ہم سگریٹ ترک کرادیں تو گویا ہم ایک خاندان کو بچالیں گے۔ کیا یہ خدمت تھوڑی ہے؟ آپ وفاقی وزیرِ صحت کو اسلام آباد کے پتے پر خط لکھ سکتے ہیں۔

ضرغام راجہ ،۔ سعود آباد۔ کراچی ،۔ سلمان غزالی کا سفر نامہ "مادام تساؤ کے دیس میں" پڑھا۔ مزہ آیا۔ کیا مادام تساؤ کے گھر میں کسی پاکستانی کا مجسّمہ نہیں ہے۔ جواب ضرور دیجئے گا۔

● ایک اطلاع کے مطابق، مادام تساؤ، کے مومی عجائب گھر میں قائدِاعظمؒ اور شہیدِ ملّت لیاقت علی خان کے مجسّمے موجود تھے لیکن جب پاکستان دولتِ مشترکہ سے نکل گیا تو یہ مجسّمے بھی وہاں سے ہٹا دیے گئے۔ چونکہ مسلمانوں میں مجسّمہ سازی حرام ہے۔ اس لیئے، ہمیں اس کی فکر نہیں کرنی چاہیئے کہ وہاں مجسّمے پاکستان کے دولتِ مشترکہ میں دوبارہ شامل ہونے کے بعد رکھے جاتے ہیں یا نہیں۔

آفتاب خان، اٹک سٹی ،۔ میں اٹک کالج کا سالِ اوّل کا ایک غریب طالب علم ہوں۔ آپ کی اسکالرشپ میرے لیئے بہت سی خوشیاں لاسکتی ہے۔ اور اس سے میری بہت سی ضروریات پوری ہوسکتی ہیں اور میں ہی اس کا مناسب حق دار ہوں۔

● اسکالرشپ کی اسکیم کا ایک طریقۂ کار وضع کردیا گیا ہے۔ اس ملک میں بے شمار حق دار طالبِ علم ہیں۔ اس لیئے فیصلہ قرعہ اندازی ہی کے ذریعے ہونا چاہیئے۔

علی حسن لغاری۔ ماتلی ،۔ آنکھ مچولی کے ہر شمارے میں "سب سے بڑا انسان" کو سلسلہ وار شائع کیجئے۔ اسی طرح ہم مسلمانوں کی اسلامی معلومات میں اضافہ ہوگا۔ اور سب کا ایمان تازہ ہوگا۔

● "سب سے بڑا انسان" واقعی ایمان افروز کتاب ہے۔ اسی لیئے ادارہ آنکھ مچولی نے اسے دوبارہ شائع کیا ہے۔ جو بچّے

اُسے پڑھنا چاہتے ہیں وہ اُسے خرید سکتے ہیں۔

شہلا صدیقی ؟ :۔ رسالے کی قیمت اچانک دس روپے ہوگئی۔ ہم جیسے غریب لوگ دس روپے کہاں سے لائیں۔ اگر قیمت کا یہی حال رہا تو اگلے سال اس کی قیمت دس روپے سے بھی بڑھ جائے گی۔ اور یہ رسالہ صرف ایک ہی طبقے کے لئے مخصوص ہو جائے گا۔

● بھئی رسالے کی قیمت اچانک نہیں بڑھی۔ قیمت بڑھانے کی وجہ بتاتے بتاتے تو ہمارے حلق سُوکھ گئے اور قلم کی سیاہی خُشک ہوگئی۔ اگلے سال تک انشاءاللہ قیمت میں کوئی اضافہ نہیں ہوگا۔

دیارام مکوانہ ،میرپور خاص :۔ آنکھ مچولی جہاں مکمل رسالہ ہے وہاں آہستہ آہستہ اس کا معیار بھی گرتا جا رہا ہے۔ اگر آپ کو اس کی قیمت بڑھانی ہی تھی تو اس کے صفحات بھی بڑھانا لازمی تھا۔ آپ نے صرف چالیس صفحات بڑھائے ہیں اور رنگین صفحات کا معیار بھی پہلے جیسا نہیں ہے۔ آپ نے ایک دوست کے خط کے جواب میں کہا تھا کہ کباب تکّے کی دکان کھولنے سے آپ زیادہ منافع کما سکتے ہیں۔ میں کہوں گا کہ آپ کو رسالہ نکالنے سے زیادہ منافع پہنچتا ہے۔ اگر آپ نے کسی بات پر بُرا مانا ہو تو میں معافی مانگنے کے لئے تیار ہوں۔

● اے بھائی دیارام! آپ تو بہت غصّے میں دکھائی دیتے ہیں۔ چالیس صفحات بڑھائے۔ آپ کا شکوہ دُور نہ ہُوا۔ ہزاروں روپے کی اسکالرشپ اسکیم شروع کی گئی۔ سو وہ بھی آپ کو نظر نہ آیا۔ رسالے کی دلکشی بڑھائی گئی، پھر بھی آپ کو معیار کا شکوہ رہا۔ وجہ صرف یہ ہے کہ قیمت دس روپے کیوں ہے۔ دنیا کی ہر چیز پر مہنگائی بڑھے تو آپ چُپ چاپ اسے قبول کر لیتے ہیں۔ رسالے پر اس لئے ناراض ہوتے ہیں کہ اس میں "ڈاکیہ ڈاک لایا" کا کالم ہوتا ہے۔ خیر کوئی بات نہیں۔ اور ہاں جو باتیں آدمی سچائی سے کہے اس پر معافی نہیں مانگنی چاہئے۔

ہمارے حوصلے بلند ہیں

طارق محمود انجم ۔ رحیم یار خان :۔ میں آپ کی تحریک "بڑوں کو سمجھائیں۔ سگریٹ نوشی گناہ ہے" میں شامل ہوگیا ہوں۔ اشتہار پڑھ کر میں گلی میں نکلا۔ دیکھا ایک صاحب سگریٹ پی رہے ہیں۔ وہ مجھے جانتے تھے۔ میں نے اُن سے کہا کہ سگریٹ پینا چھوڑ دیں تو بڑی مہربانی ہوگی۔ یہ زہر ہے۔ انہوں نے غصّے میں جواب دیا: تم کو کیا تکلیف ہے۔ مجھ کو نقصان ہوگا تم بڑوں کے ساتھ بدتمیزی کرتے ہو۔ شرم نہیں آتی۔ اور اتنا کچھ ۔۔ کیا بتاؤں پھر میں نے دو چار آدمیوں سے اور بھی کہا تو ہر ایک سے یہی جواب ملا۔ انکل! اگر ہم مایوس نہیں ہوئے ہمارے حوصلے بلند ہیں۔ انشاءاللہ ہم ایک دن کامیاب ہوں گے۔

● پیارے طارق! ہر تحریک میں شروع شروع میں ایسی ہی دشواریاں پیش آتی ہیں۔ پھر آہستہ آہستہ لوگ قائل ہوتے جاتے ہیں۔ جو لوگ سالہا سال سے سگریٹ پی رہے ہیں وہ فوراً تو اُسے نہیں چھوڑیں گے۔ لیکن انہیں بار بار سمجھانا پڑے گا۔ ادب اور تہذیب کے ساتھ ۔ ہمیں آپ پر فخر ہے کہ آپ نے ہمت نہیں ہاری ہے۔ کوششیں جاری رکھئے۔

نسیم انور، ٹوبہ ٹیک سنگھ :۔ میرے خط کا کوئی جواب نہیں دیا جاتا۔ کیونکہ میں ایک چھوٹے سے شہر سے تعلق رکھتا ہوں۔ آپ تو بڑے بڑے شہروں کے لڑکوں کے خطوط اور دوسری چیزیں شائع کرتے ہیں اور ہمیں نظرانداز کر دیتے ہیں۔ ... میں ایک کہانی بھیجنا چاہتا ہوں کیا وہ شائع ہو جائے گی؟

● آپ کے "چھوٹے سے شہر" سے آنے والے خط پابندی سے آنکھ مچولی میں چھپتے رہے ہیں۔ یقین نہ آئے تو پُرانے رسالے اُٹھا کر دیکھ لیجئے... چھوٹے اور بڑے شہر کا فرق کوئی اور کرتا ہو تو کرتا ہو۔ ہم نہیں کرتے۔ آپ کے خط کا جواب اس لئے نہیں دیا گیا کہ آپ نے کوئی پوچھنے والی بات پوچھی نہیں ہوگی۔ اب یہی دیکھئے کہ آپ کہانی بھیجنے کے بجائے ابھی یہی پوچھ رہے ہیں کہ کیا کہانی بھیج دوں؟ ارے صاحب فوراً بھیجئے۔

عدنان محمود صدیقی، حیدر آباد :۔ انکل! کیا "خوفناک نمبر" کے لیے میں ۳۰ ستمبر ۱۹۸۸ء کا سانحۂ حیدر آباد کی تفصیل لکھ کر بھیج سکتا ہوں۔ یہ واقعہ ہمارے ساتھ پیش آیا تھا اور میرے گھر پر بھی فائرنگ کی گئی تھی۔

● عدنان! سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ تمہیں کیا جواب دوں۔ جو کچھ حیدر آباد پر بیتی ہے۔ وہ ہماری قومی تاریخ کا سیاہ ترین باب ہے۔ اسے تاریخ ہی کے لیے محفوظ رکھو۔ "خوفناک نمبر" ہم رُلانے کے لئے شائع نہیں کر رہے ہیں اور تمہاری کہانی یقیناً خون کے آنسو رُلا دینے والی ہوگی۔

محمد مسعود قریشی، اٹک سٹی :۔ کیا یہ بات صحیح ہے کہ دنیا میں ایک جگہ ایسی ہے کہ جہاں اگر کوئی بحری جہاز یا ہوائی جہاز جائے تو غائب ہو جاتا ہے اور اس کا کبھی کوئی نام و نشان نہیں ملتا۔

جی ہاں ... ایک ہی نہیں دنیا میں ایسی بہت سی جگہیں ایسی ہیں۔ حال ہی میں ایک پاکستانی طیارہ گم ہو چکا ہے اور کوئی سراغ نہیں ملا۔ کئی بحری جہاز بھی سمندر کی تہہ میں غرق ہو جاتے ہیں اور کچھ پتہ نہیں چلتا۔ ویسے آپ ایسی کس جگہ کے متعلق پوچھ رہے ہیں۔ ہمیں نہیں معلوم۔

یہ طرّۂ امتیاز صرف ہمارا ہے

ماہنامہ آنکھ مچولی پاکستان بھر میں بچوں کا وہ واحد ماہنامہ ہے جس کا عام شمارہ بھی ۱۶۲ صفحات پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ حسین رنگوں کے ۸، صفحات اور آئے دنوں نت نئے تحائف دینے کی روایت بھی آنکھ مچولی نے قائم کی۔ اپنی ان ظاہری خوبیوں کے علاوہ... تحریروں کا اعلیٰ معیار اور بے شمار دلچسپیوں کو ہر ماہ صرف ۱۰، روپے کے عوض آپ تک پہنچانا بھی ادارۂ آنکھ مچولی کا طرّۂ امتیاز ہے۔

ایک چھوٹی سی کہانی

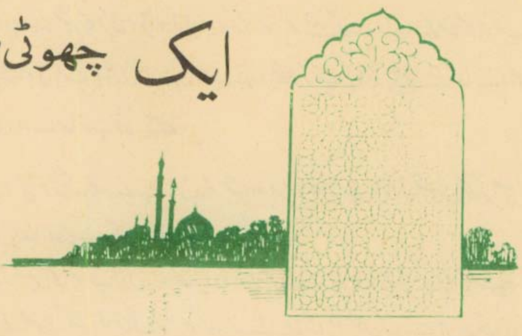

معاویہ کا بیٹا ایاس بڑا ذہین لڑکا تھا۔ نہیں معلوم خدا نے کونسی مٹی سے اُس کا خمیر بنایا تھا۔ کہ جب کوئی بات کرتا تو بچے اور بوڑھے حیرت سے اُس کا منہ تکتے رہ جاتے۔ فطرت کے ہر کام پر وہ ایسی گہری نظر ڈالتا تھا کہ کیا مجال ہے جو کوئی بھید کی بات اس سے چھُپی رہ جائے۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ ایک ہنستا کھیلتا فلسفی تھا۔

ایک دفعہ ایاس اپنے دوستوں میں بیٹھا باتیں کر رہا تھا کہ کسی کتے کی آواز آئی۔ اُس نے کہا دیکھنا! یہ کُتّا تو کسی اور گاؤں کا معلوم ہوتا ہے۔ یہ سُن کر کچھ لڑکوں نے تو اُس کی بات کو ہنسی میں ٹال دیا۔ لیکن بعض ایسے بھی تھے جن کے دل میں یہ کُرید پیدا ہوئی کہ ایاس نے بیٹھے بٹھائے یہ کیا کہہ دیا۔ وہ فوراً کتّے کی آواز پہ دوڑے گئے اور جا کر دیکھا تو واقعی کتّا کسی اور گاؤں کا تھا۔ بڑی حیرت ہوئی۔ پھر آئے اور پوچھا "ایاس تم نے کس طرح معلوم کیا کہ یہ کتا یہاں کا نہیں"۔ ایاس نے کہا اس کی آواز سے" انھوں نے اور بھی زیادہ تعجب سے پوچھا "تو کیا تم اُس کی بولی جانتے ہو"؟ کہا نہیں۔ صرف اتنا جانتا ہوں کہ جب کسی غیر جگہ سے کوئی کتّا آتا ہے تو دوسرے کتّوں کے ڈر سے بڑی دبی ہوئی آواز نکالتا ہے۔

اسی طرح ایک اور دفع کا ذکر ہے کہ ایاس اپنے ہمجولیوں کے ساتھ سیر کو نکلا۔ چلتے چلتے

جب سب تھک گئے تو سستانے کے لئے جنگل میں ایک سرسبز جگہ دیکھ کر بیٹھ گئے ۔ اور اِدھر اُدھر کی باتیں شروع کر دیں ۔ ایک لڑکا جو سب سے زیادہ تھک گیا تھا کسی پتھر سے کمر لگا کے لیٹنے لگا ۔ ایاس نے کہا بھئی وہاں سے ہٹ جاؤ اور اِدھر آکے لیٹ جاؤ ۔ لڑکا ضدی تھا ۔ وہاں سے نہ ہٹا ۔ اس پر ایاس نے پھر اصرار کیا اور کہا کم بخت اس پتھر کے نیچے سانپ ہے اس پر سے اُٹھ جا ۔ اب تو یہ لڑکا بہت سٹ پٹایا اور چونکہ اُسے یقین تھا کہ ایاس کی باتیں سچی ہوا کرتی ہیں ۔ سراسیمہ ہو کر اس پتھر سے بہت دُور جا کھڑا ہُوا ۔ یہ دیکھ کر بعض من چلے لڑکوں کو خیال ہُوا کہ آؤ ایاس کی بات کو آزمائیں ۔ انہوں نے لکڑی لے کر بڑی احتیاط سے پتھر کو ہٹایا ۔ دیکھا تو واقعی اُس کے نیچے ایک سانپ لیٹا ہوا ہے ۔ لڑکوں نے فوراً لکڑیوں سے اور پتھروں سے اُس کو مار ڈالا ۔ اور پھر ایک حیرت آمیز لہجے میں دریافت کیا "کیوں ایاس تمہیں کیسے خبر ہوئی کہ پتھر کے نیچے سانپ لیٹا ہے ؟" اُس نے کہا "یہ پتھر ایک طرف سے کسی قدر سیلا ہوا تھا ۔ جس سے مجھے یہ خیال پیدا ہُوا کہ اس کے نیچے ضرور کوئی نہ کوئی جانور ہے جس کے سانس نے اس کو نمی پہنچائی ہے ۔"

خیر یہ قیاسات تو ایسے ہیں کہ جن سے ہم ایاس کے ہمجولیوں کی طرح زیادہ تر تعجب ہی کر سکتے ہیں ۔ کیونکہ اگرچہ وہ کسی قدر مشق کے بھی محتاج ہیں لیکن اکثر خداداد ہوتے ہیں ۔ اور ان کی تقلید کرنا مشکل ہوتا ہے

ایاس ابھی لڑکا ہی تھا کہ اُسے ایک عجیب آفت کا سامنا ہوا ۔ دمشق کے ایک نیک صورت اور بدسیرت بڈھے نے چالبازی سے اس بیچارے کے پیسے ہضم کر لئے ۔ ایاس اس سے روپیہ مانگتا تھا مگر وہ دغاباز نہیں دیتا تھا ۔ آخر کار مظلوم لڑکے نے تقاضا کرنا چھوڑ دیا اور اس کی خوشامد درآمد شروع کی مگر بڑے میاں کو روپیہ دینا منظور ہی نہ تھا وہ نہ پسیجے ایاس نے ہزار منت کی لیکن اُن کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی ۔ والدین کے سوا ایاس کے سارے عزیز واقربا موجود تھے ۔ لیکن اس بہادر لڑکے نے اپنا کام اپنے ہی دست و بازو سے لینا پسند کیا ۔ وہ بڈھے کو جبراً پکڑ کے شہر کے قاضی کے پاس لے گیا ۔ اور سرِ اجلاس کہا کہ "قاضی صاحب کا خدا بھلا کرے یہ بڈھا بڑا ظالم ہے ۔ میرا مال دغابازی سے لے کر ہضم کر چکا ہے اور اب اس سے مانگتا ہوں تو دیتا نہیں ۔" قاضی نے کہا "اے ناسمجھ اور گستاخ لڑکے بڈھوں کے ساتھ اس طرح پیش نہیں آیا کرتے ۔ وہ تجھ سے بڑا ہے اس کا ادب کر ۔" ایاس نے بے ساختہ جواب دیا "جس کو حق کہتے ہیں وہ مجھ سے اور اس سے اور خود قاضی صاحب سے بھی بڑا ہے ۔" قاضی اس

پرسخت برافروختہ ہوا۔ اور ایاس سے کہا "بس۔ خاموش رہ" ایاس نے کہا" میں خاموش رہوں گا۔ تو میری طرف سے عدالت میں لڑنے کون آئے گا" قاضی کے غصّے کی انتہا نہ رہی۔ اُس کے پاس اگر کوئی شرعی عُذر ہوتا تو وہ ایاس کو سزا دیئے بغیر نہ چھوڑتا۔ لیکن جیسا کہ مثل مشہور ہے کہ "سانچ کو آنچ نہیں" وہ اس معاملے میں سراسر بے اختیار تھا۔ ناچار کہا تو یہی کہا۔

"میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تیری زبان سے کلمۂ خیر نہیں نکلے گا" ایاس نے قاضی کو جھوٹا بنانے اور اس کی قسم توڑنے کے لیئے کہا (لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْكَ لَہٗ) یعنی خُدا ایک ہے اور اس کا کوئی ساجھی نہیں، قاضی نے شرما کے گردن جُھکالی اور پھر کچھ سوچ کر ناحق مقدمہ کو خارج کردیا۔

اگرچہ اُس زمانے میں اپیل کی عدالتیں موجود نہ تھیں لیکن جاسوسوں کا جال بچھا رہتا تھا۔ اور رعایا کی ہر ایک بات خلیفہ تک پہنچتی تھی۔ چنانچہ ایاس کی روداد بھی جاسوسوں نے خلیفۂ وقت حضرت عمر بن عبدالعزیز کو جا سُنائی۔ عمرؒ بن عبدالعزیز بڑے نیک دل اور دُور اندیش خلیفہ تھے۔ اور اپنے عدل وانصاف کی وجہ سے "عمر ثانی" کہلاتے تھے۔ وہ اُس لڑکے کی راستبازی اور اخلاقی جرأت سے بڑے خوش ہوئے اور قاضی کی بے جا طرفداری اور تنگ مزاجی پر بہت ناراض ہوئے۔

قاضی صاحب کو اُسی دن اس مضمون کا ایک فرمان پہنچا "امیر المؤمنین نے تم کو معزول کیا اور تمہاری بجائے ایاس بن معاویہ کو قاضی دمشق کیا"

وہی ایاس جو کل دمشق کے گلی کوچوں میں جوتیاں پٹخارتا پھرتا تھا اپنی راست بازی اور ذہانت کے باعث دارالقضا کی مسند پر جلوہ افروز ہوا۔ اور ایک عرصہ تک بڑی نیکنامی کے ساتھ دمشق اور بصرہ میں انصاف کرتا رہا۔ وہ بڑا عالم نہ تھا۔ لیکن معاملہ فہم اور راستباز انتہا کا تھا اور اسی وجہ سے خلیفۂ عمر نے جو اس کے ابتدائی حالات اپنے جاسوسوں کی زبانی سُن چکے تھے اُسے قاضی بنایا تھا۔

ایاس کی ذہانت نے وہ شہرت پائی کہ مدائنی جیسے عالم مورّخ نے اس کی عاقلانہ حکایات کو جمع کرکے ایک کتاب بنائی اور اُس کا نام "زُکنِ ایاس" رکھا۔ ایاس نے ۱۱۰ھ میں وفات پائی۔

خُدا کرے کہ ہم بھی ایاس کی طرح راست گو اور راستباز بنیں۔ کیونکہ راستی انسان کا سب سے بڑا فرض ہے۔

بدقسمتی سے آجکل کے بچے ہی نہیں بلکہ بوڑھے بھی سچ کو اکثر اپنے دلوں ہی میں رکھتے ہیں۔ لیکن بچو! اگر تم ترقی کے زینے پر چڑھنا چاہتے ہو تو ایاس کی طرح سچ بولو اور ڈنکے کی چوٹ پر سچ بولو۔

سفید اونٹ

آہا! میرا اونٹ سراب کتنا تیز بھاگ رہا ہے ماشاء اللہ امین نے اُسے دوڑنے کی شاندار تربیت دی ہے
شیخ معاذ! لگتا ایسا ہی ہے کہ تمہارا اونٹ مقابلہ جیت جائے گا
مجھے صرف تاجر میمون سے خطرہ ہے۔ اس کا اونٹ برق بھی تو مقابلے میں شریک ہو رہا ہے
?
برق کو جیتنے سے کوئی نہیں روک سکتا
اس کے لئے تمہیں کوئی ایسی ترکیب کرنی چاہئے کہ سراب مقابلے میں شریک ہی نہ ہو سکے
میرے ذہن میں ایک زبردست ترکیب آئی ہے
مقابلے کا دن قریب آ رہا ہے میں سراب کو دوڑنے کی مشق کے لئے صحرا میں لے جا رہا ہوں!
ضرور، ضرور! یہ مقابلہ ہمیں جیتنا ہی ہے

!?
اے بددیانت نوجوان! تجھے میرے آقا میمون کے چشمے سے اپنے اونٹ کو پانی پلانے کی ہمت کیسے ہوئی؟
اس میں ناراض ہونے کی کیا بات ہے؟ میرا اونٹ پیاسا تھا اس لیے پانی پلا دیا۔
یہ مجرم ہے اور تمہیں اس کی سزا ملے گی۔ تمہارا اونٹ ضبط کیا جاتا ہے!
یہ ہے کل داستان میرے آقا!
سمجھ میں نہیں آتا کہ میمون نے ایسا کیوں کیا؟ یہ تو سراسر ظلم ہے
مقابلے کا دن سر پر آپہنچا ہے۔ سراب اب تک میمون کے قبضے میں ہے۔ بتایئے میں کیا کروں؟

سراب کو چھوڑنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس نے میرے چشمے سے پانی کیوں پیا؟
چلیے آپ کی ضد کے آگے جھکتے ہیں۔ ہم سراب کو چھوڑ دیتے ہیں مگر اس شرط پر کہ اب یہ سفید اونٹ ریس میں حصہ نہیں لے گا۔
جیسی آپ کی مرضی
میں سمجھ گیا۔ اصل میں میمون کے لوگوں نے سازش کا جال بچھایا تھا تاکہ سراب ریس میں شریک ہی نہ ہو سکے لیکن میں نے بھی ان کی مکاری کا توڑ سوچ لیا ہے۔
سبحان اللہ! زبردست ترکیب ہے، مجھے فوراً اس پر عمل کرنا چاہیے
میمون کا مطالبہ یہی تھا کہ سفید اونٹ اس میں حصہ نہیں لے سکتا لیکن اب یہ اونٹ سفید ہی کہاں رہا۔
بداية السباق
ارے واہ! یہ بھلا کس کا اونٹ ہے جو میمون کے اونٹ برق سے بھی آگے نکل گیا ہے
میمون صاحب مجھے تو پتا نہیں
شیخ معاذ نے ہمارے ساتھ دھوکہ کیا اس نے وعدہ کیا تھا کہ اپنے سفید اونٹ کو مقابلے میں شریک نہیں کرے گا
ہم نے اپنا وعدہ پورا کیا اور مقابلے میں ہماری طرف سے کوئی بھی سفید اونٹ شریک نہیں ہوا
سراب کو کامیاب قرار دیا جاتا ہے
امین کا جواب نہیں اس نے میمون کی سازش کو ناکام بنا دیا۔
امین نے ذہانت کی دوڑ بھی جیت لی
بے شک دھوکے باز لوگ اسی طرح منہ کے بل گرتے ہیں

سلمیٰ سلیم

کارچلانے والاگھوڑا ہے انسان ساتھوڑاتھوڑا

لیجیئے گھوڑے میں اور آپ میں کوئی فرق نہیں رہا۔ ہمارا مطلب ہے ایک فرق نہیں رہا اور وہ یہ کہ اب گھوڑا بھی آپ کی طرح کار چلانے لگا ہے۔ آپ نے ٹھیک کہا اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔ اگر ہم گھوڑے کی طرح کے کام کر سکتے ہیں۔ مثلاً اساتذہ کرام کے بقول گھاس کھا سکتے ہیں یا دوستوں کے بقول دولتی جھاڑ سکتے ہیں۔ تو گھوڑا ہماری طرح کے کام کیوں نہیں کر سکتا ؟ مگر جناب یہ کوئی عام گھوڑا نہیں بلکہ ایک بہت ہی خاص گھوڑا ہے۔ اس گھوڑے کا نام بٹر اسکاچ اور اس کے مالک کا نام ایچ مارس ہے۔ اس گھوڑے کے ضدی پن اور بے جا اُچھل کُود کی عادت کو دیکھتے ہوئے اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ یہ کسی کام کا نہیں۔ تاہم مارس کا خیال تھا کہ اس گھوڑے سے دُنیا کے تمام گھوڑوں سے زیادہ اور مفید کام لئے جا سکتے ہیں۔ اپنے اس یقین کی بنیاد پر ایچ مارس نے

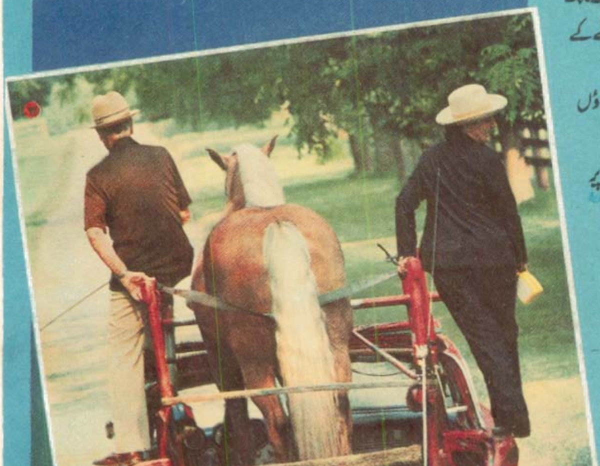

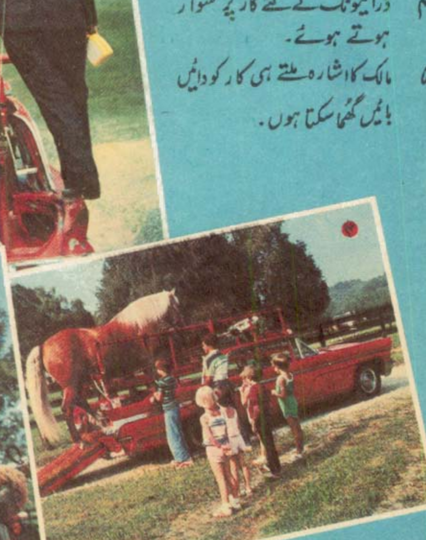

۱ آؤ میں تم کو ایک پیار کروں۔ بٹر اسکاچ اپنے مالک ایچ مارس کو کار سے گردن نکال کر پیار کرنے کے لئے تیار ہے۔

۲ لیجیئے لگ گیا بریک میاں۔ بٹر اسکاچ کا پاؤں اپنے سائن کے بریک کے اُوپر

۳ ڈرائیونگ کا حقیقی مزا تو ایسی ہی جگہ پہ آتا ہے۔

۴ ڈرائیونگ کے لئے کار پہ سوار ہوتے ہوئے۔

۵ مالک کا اشارہ ملتے ہی کار کو دائیں بائیں گھما سکتا ہوں۔

بڑا اسکاچ کو سدھانے کا کام شروع کیا۔ مارس بڑا اسکاچ کو اپنے حکم کی تعمیل پر بہت بہت شاباش دیتا اور اُسے اُس کا من پسند کھانا فراہم کرتا۔ نتیجتاً ایک سال کے اندر اندر بڑا اسکاچ نے اپنی پیٹھ پر زین اور سوار کو گوارہ کر لیا۔ پھر دھیرے دھیرے اُس نے عام گھوڑوں کی طرح کے بہت سے کرتب بھی سیکھ لئے۔ آپ نے دیکھا مسلسل محبّت اور محنت سے انسان تو کیا جانور بھی بدل جاتے ہیں۔

اس کے بعد مارس نے بڑا اسکاچ کو کار سکھانے کا ارادہ کیا۔ اس مقصد کے لئے مارس نے ایک کھلی کار میں ایسی تکنیکی تبدیلیاں کیں۔ جن کے بعد بڑا اسکاچ کے لئے کار کو چلانا ممکن ہوگیا۔ ایک سال کی ٹریننگ کے بعد بالآخر بڑا اسکاچ کسی کی مدد کے بغیر کار چلانے کے قابل ہوگیا۔

کار کو اسٹارٹ کرنے اور اُسے گیئر میں ڈالنے کے لئے بڑا اسکاچ اپنے منہ کا استعمال کرتا ہے۔ اس کے بعد وہ ایکسی لیٹر پر پاؤں رکھ دیتا ہے اور کار دوڑنے لگتی ہے۔ بڑا اسکاچ کار کو زیادہ سے زیادہ ۳۲ کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے چلا سکتا ہے۔ بڑا اسکاچ اسٹیئرنگ وہیل کو اپنی ناک کی مدد سے دائیں بائیں گھماتا ہے۔ مارس کا حکم ملتے ہی بڑا اسکاچ بریک پر پاؤں رکھ کر کار کو روک دیتا ہے۔

مارس کار میں اور بھی کئی تبدیلیاں لایا ہے۔ جن کے بعد بڑا اسکاچ صاحب ہارن بجانے اور ٹیپ ریکارڈر پر گیت تک سُننے کے قابل ہوگئے ہیں۔ اطلاع ہے کہ گھوڑے صاحب کو مغربی موسیقی بہت پسند ہے، پاپ موسیقی کے شوقین یہ بات نوٹ کر لیں کہ ایک گھوڑا بھی پاپ موسیقی سُنتا اور پسند کرتا ہے۔

بھئی اس میں ناراض ہونے کی کیا بات ہے؟ ہم نے تو صرف یہی بتانے کی کوشش کی ہے۔ انسان ہی نہیں گھوڑا بھی باذوق ہوتا ہے۔

نرالا سوال

وقاص تسلیم - گل بہار کراچی

"ان سوالوں کے ہندسے ایک جیسے ہیں مگر جواب سب کے مختلف ہیں کیا آپ ان ہندسوں کے درمیان اس طرح جمع تفریق تقسیم یا ضرب کے نشان لگا سکتے ہیں کہ جواب یہی آئیں؟"

9	6	3	=	12	9	6	3	=	57
9	6	3	=	1	9	6	3	=	51
9	6	3	=	9	9	6	3	=	162
9	6	3	=	6	9	6	3	=	45
9	6	3	=	18	9	6	3	=	5

جواب ۵ صفحات کے فاصلے پر

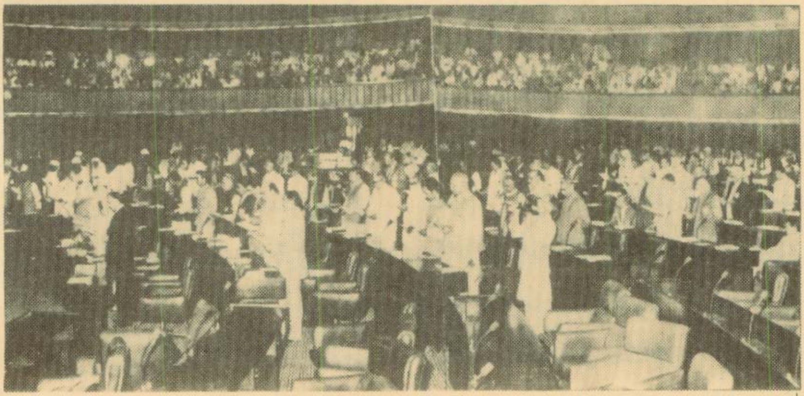

یکم دسمبر ۱۹۸۸ء کو
اراکین قومی اسمبلی نے آئین کے تحفظ اور بالادستی کا
حلف اُٹھایا تھا

آئین کے آرٹیکل ۱۹ میں کہا گیا ہے:

"ہر شہری کو آزادیٔ تقریر اور اظہار کا حق حاصل ہوگا اور پریس کو آزادی حاصل ہوگی۔ جو اسلام کی عظمت، پاکستان یا اس کے کسی حصے کے دفاع، سالمیت اور استحکام، غیر مُلکی ریاستوں سے دوستانہ تعلقات، امن عامہ، اخلاقی اقدار کے مفاد میں یا توہین عدالت، ارتکاب جرم سے متعلق قانون کی طرف سے عائد مناسب پابندیوں سے مشروط ہوگی۔"

تاہم صرف ۵ ماہ بعد حکومت نے پریس کی آزادی پر ٹیکس عائد کر دیا۔ نیوز پرنٹ پر لگائی گئی تین ہزار روپے فی ٹن درآمدی ڈیوٹی دنیا بھر میں سب سے زیادہ ہے جبکہ اقرار سمیت دیگر سَر چارجز اس کے علاوہ ہیں۔

اخباری کاغذ پر ڈیوٹی کو محض اخبارات کے منافع پر ٹیکس نہیں سمجھنا چاہیئے۔ نیوز پرنٹ کی گرانی کی وجہ سے اخبارات و جرائد کی قیمتوں میں اضافہ ناگزیر ہو جائے گا۔ پاکستان نہ صرف فی کس آمدنی کے لحاظ سے بلکہ شرح خواندگی کے اعتبار سے بھی دُنیا کے پسماندہ ترین مُلکوں میں شمار ہوتا ہے
اِن حالات میں کیا پاکستانی قاری علم پر ایک نئے ٹیکس کا متحمل ہو سکتا ہے؟

اراکین قومی اسمبلی پر بھی یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ نیوز پرنٹ پر نئی درآمدی ڈیوٹی اور دیگر سرچارجز کی واپسی کو یقینی بنائیں۔ تاکہ آئین میں دی گئی آزادیٔ صحافت کی ضمانت کی تکمیل ہو سکے۔

APNS
آل پاکستان
نیوز پیپرز سوسائٹی

اسپکٹرم کمیونیکیشنز لمیٹڈ نے آزادیٔ صحافت کے لئے تیار کیا۔

سلمان غزالی

"آج اکتیس دسمبر ہے" فراز نے آرام دہ صوفے پر دراز ہوتے ہوئے کہا۔
"تو پھر... یہ تو ہم سب جانتے ہیں" ناصر نے تپائی پر سے میگزین اُٹھاتے ہوئے کہا۔
"بھئی میرا مطلب ہے کہ آج سال کا آخری دن ہے، آج رات پورا ایک سال تمام ہو جائے گا" فراز کی اس بات پر ناصر، حیات، رانی اور فوزیہ اُس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ وہ فراز کی بات کا مطلب سمجھ گئے تھے۔ فراز نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "چونکہ آج کا دن خاص اہمیت کا حامل ہے اس لئے پچھلے برسوں کی طرح آج کوئی خاص پروگرام بھی ہونا چاہیئے۔ مثلاً کوئی فلم یا پارٹی وغیرہ کوئی ہلا گلہ تو ہونا چاہیئے نا۔ کہیں اس سال کی آخری شب یوں ہی بور نہ گزر جائے۔"

ایک سال اور • نیا سال خوشی کا لمحہ یا تشویش کا؟

فوزیہ جھٹ بولی "وہ تو سب ٹھیک ہے مگر ایک تو رات میں چند گھنٹے رہ گئے ہیں اور پھر اس دفعہ تو ہم سب کی جیبیں خالی ہیں۔"

"بیس روپے تو میرے پاس ہیں کل امی نے بازار سے سامان منگوایا تھا تو بیس روپے بچے تھے میرے پاس، جو امی کو اب یاد بھی نہیں" فراز نے جیب سے دس دس کے دو نوٹ نکال کر سب کی نظروں کے سامنے لہراتے ہوئے کہا۔

"اور تیس روپے میں نے صبح ہی باجی کو اپنے رجسٹر میں چھپاتے دیکھا ہے میں ابھی نکال لیتا ہوں۔" حیات نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا۔

"ویری گڈ پھر تو بن گیا کام، فوزیہ تم ایسے کرو کہ فریج سے کیک نکال لو، کل ہی امی نے مہمانوں کے لئے منگوایا تھا۔ اور چاٹ کے لئے جو سامان رکھا ہوا ہے اُس سے چاٹ تیار کرلو۔ میں پچاس روپوں کا بازار سے کچھ لے آتا ہوں۔ اور ناصر تم بھائی جان کی الماری سے وہ نئی وڈیو کیسٹ نکال لو جو وہ آج صبح ہی لے کر آئے ہیں"۔ فراز نے سب کو ہدایات دیتے ہوئے کہا۔

"بالکل ٹھیک ہے امی، ابو، بھائی جان اور باجی خود تو مزے کر رہے ہوں گے اور ہم ... ہم بھی انجوائے کریں گے خوب ہلا گلا کریں گے اور اس سال کو شاندار طریقے سے رخصت کریں گے۔" ناصر نے فراز کی تائید کی۔

"ہاں بھئی امی ابو سب لوگ تو رات تک ہی آئیں گے۔ اتنی دیر میں ہمیں جو کچھ کرنا ہے کرلینا چاہئے۔" فوزیہ گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے بولی۔

"چلو بھئی اب جلدی سے ہمیں تمام بندوبست کرلینا چاہئے۔" حیات نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا تو ناصر فراز اور فوزیہ بھی اپنی جگہوں سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

"ارے ایک بات ہم بھول ہی گئے۔" فراز چلتے چلتے ایک دم ٹھٹھک کر رُک گیا اور چونک کر کہا جیسے اُسے کوئی بات یاد آگئی ہو۔

"وہ کیا؟" تینوں نے حیرت سے پوچھا

"ارے بھئی وہ ہی نئے سال کی خوشی میں باجی اور بھائی جان کا انعام، ربر کا سانپ، پلاسٹک کے بنے ہوئے پانی سے بھرے ہوئے گلاب۔" فراز نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے بڑے معنی خیز انداز میں کہا تو ناصر، فوزیہ اور حیات مسکرا دیئے وہ فراز کی بات کا مطلب سمجھ گئے تھے۔ اس طرح کی وہ شرارتیں کرتے رہتے تھے۔ ان کے چہروں پر شرارت آمیز مسکراہٹ رقص کرنے لگی تھی اور آنکھوں میں چمک آگئی تھی جبکہ ان کے برعکس رانی ابھی تک صوفے پر بیٹھی

تھی اوران سب کی طرف حیرت سے تکے جارہی تھی ۔ حیات ،فراز ، ناصر اور فوزیہ سگے بہن بھائی تھے جبکہ رانی ان کی کزن تھی اور دوسرے شہر میں مقیم تھی ۔ آج کل وہ سردیوں کی چھٹیاں منانے یہاں آئی ہوئی تھی ۔ اس نے ابھی تک گفتگو میں حصّہ نہیں لیا تھا۔اب جب کہ اُس نے اُنہیں جاتے دیکھا تو بول اُٹھی " تو کیا تم لوگ واقعی ہی آنٹی اور باجی کی اجازت کے بغیر روپے نکالو گے ۔ اور پھر یہ مہمانوں کے لئے لایا ہوا سامان،سانپ اور پھول والا مذاق...کیا وہ سب ناراض نہیں ہوں گے "

" ارے ناراضگی کیسی ،آخر سال کا اختتام ہورہا ہے ۔کل نئے سال کی خوشی میں وہ سب ہمیں کچھ بھی نہیں کہیں گے اگر سزا مل بھی گئی تو وہ اس لُطف سے کہیں کم ہوگی جو ہم آج اُٹھائیں گے " فراز نے ہاتھ نچاتے ہوئے جواب دیا ۔ باقی تینوں بھی رانی کو یوں دیکھنے لگے جیسے اُس نے کوئی نہایت ہی مضحکہ خیز بات کہہ دی ہو ۔رانی نے بھی ان سب کا رویّہ دیکھتے ہوئے مزید بحث مناسب نہ سمجھی اور خاموش ہوگئی ۔ ان چاروں بہن بھائیوں کے لئے یہ کوئی نئی بات نہ تھی ۔وہ ہر سال یوں ہی کرتے تھے ۔ اوراس میں اُن کا بھی اتنا قصور نہ تھا ان کو ماحول ہی ایسا ملا تھا۔ اُن کے بڑے بھی سال کے اختتام اور نئے سال کی آمد کو ایک شاندار جشن کا بہانہ سمجھتے تھے ۔ نتیجتاً اُن کے چھوٹے بھی مناسب تعلیم وتربیت کی کمی کے باعث اسی ڈگر پر چلے جارہے تھے ۔ لمحہ بہ لمحہ گزرتے ہوئے اُن کے ماہ وسال بند مٹھی سے ریت کی مانند پھسلتے جارہے تھے اور وہ اس حقیقت سے بے خبر کہ اُن کی زندگی کی مٹھی خالی ہوتی جارہی ہے انہی فضولیات کو حقیقت سمجھتے ہوئے زندگی نبھا رہے تھے ۔جبکہ ان کے مقابلے میں رانی نے ایک اچھے ماحول میں تربیت پائی تھی ۔ اور وہ اس مختصر زندگی کی اہمیت کو اچھی طرح سمجھتی تھی ۔ وہ بھی وقت پر کھیلتی کودتی تھی تفریح کرتی تھی مگر وقت اور تہذیب کا خیال رکھتے ہوئے ۔ ان چاروں کے انداز دیکھتے ہوئے وہ سمجھ گئی تھی کہ انہیں سمجھانا بے کار ہے ۔چنانچہ وہ اُنہیں اُن کے حال پر چھوڑ کر اپنے کام میں مصروف ہوگئی ،چاروں طے شدہ پروگرام کے مطابق اپنے اپنے کام کرنے لگے ۔اور رانی نے اپنے بیگ سے کپڑوں کا نیا جوڑا نکالا اور استری کرنے لگی ۔کپڑوں پر استری کرنے کے بعد وہ باتھ روم میں نہانے چلی گئی ۔ ڈیڑھ گھنٹے کے بعد تمام انتظامات مکمل ہوچکے تھے ۔ ناصر اور حیات ٹی وی،وی سی آر اپنے کمرے میں لے آئے تھے اور انھوں نے کرسیاں وغیرہ سیٹ کردی تھیں ۔ فراز بازار سے کولڈ ڈرنک وغیرہ لے آیا تھا اور فوزیہ نے کچن سے فارغ ہوکر میز لگا دی تھی تھوڑی دیر بعد ہی سب ایک مار دھاڑ سے بھرپور فلم دیکھنے میں محو تھے ۔اور ساتھ ساتھ اپنی پسند کی چیزیں کھاتے جارہے تھے ۔ کچھ دیر بعد فلم میں ایک گانا آیا تو سب ہی اونچی آواز میں گلوکار کا ساتھ دینے لگے ۔ جب کہ فراز نے تو باقاعدہ تھرکنا بھی شروع کردیا ۔ اچانک فوزیہ نے محسوس کیا کہ رانی اُن کے درمیان نہیں ہے ۔ نہا دھوکر تیار ہونے کے بعد وہ اُن کے ساتھ آئی تو تھی مگر لگتا

تھا جیسے وہ اُن کے درمیان سے کسی وقت اُٹھ کر چلی گئی تھی "ارے یہ رانی کہاں گئی؟" فوزیہ کی آواز نے سب کو چونکا دیا اور وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ مگر رانی وہاں موجود نہ تھی۔

"میرا خیال ہے کہ اپنے کمرے میں گئی ہوگی۔ لگتا ہے کہ ہم سے چھُپ کر وہ کچھ اور ہی کرنا چاہتی ہے۔ دیکھ نہیں تھا کس طرح نہا دھو کر نئے کپڑے پہن کر تیار ہوئی تھی" ناصر نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"بالکل ہمیں تو روکتی تھی اور خود چھپ کر نہ جانے کیا کر رہی ہوگی چلو چل کر اُسے پکڑتے ہیں" رانی بولی تو سب اُٹھ کھڑے ہوئے۔ رانی کے کمرے کے پاس پہنچ کر سب رُک گئے۔ دروازہ بھڑا ہوا تھا۔ مگر مقفل نہیں تھا۔ رانی نے آہستگی سے دروازہ کھولا۔ اندر نظر پڑتے ہی جیسے اُن سب کو سانپ سونگھ گیا۔ سب حیرت کی تصویر بنے پھٹی پھٹی نگاہوں سے اندر تکے جا رہے تھے۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ سامنے کی دیوار پر لگا ہوا زیرو وولٹ کا بلب روشن تھا جو صرف ایک حصے کو منوّر کرنے میں کامیاب رہا تھا۔ بلب کے نیچے رانی جائے نماز پر سجدہ ریز تھی اور اُس کی سسکیوں بھری آواز کمرے میں گونج رہی تھی "اے خدا ایک اور سال یونہی گناہوں میں بیت گیا۔ ہماری زندگی کا ایک اور سال کم ہوگیا۔ اور ہم یونہی غافل ہیں ہم بہت گناہ گار ہیں اے مالک ہمارے گناہ معاف فرما، ہمیں ہدایت دے، نئے آنے والے سال کو ہمارے لئے مبارک کر اور ہمیں گناہوں سے بچا..." وہ کہے جا رہی تھی اور وہ سب دم بخود کھڑے تھے۔ چند لمحے پہلے ہی اُنہیں سرور بخشنے والے گانے کی آواز اب اُن کی سماعتوں سے برچھیوں کی مانند ٹکرا رہی تھی۔ اُن کے رگ و پے میں اُترا ہوا چوری کے روپے اور سامان کا میٹھا زہر اب اپنی تلخی دکھانے لگا تھا۔ حقیقت سے آشنائی نے اُن کے سر جھکا دیئے تھے۔ اور وہ شرم سے زمین میں گڑے جاتے تھے۔ اور پھر رات کے بارہ بجے جب گزرا ہُوا سال آنے والے سال سے بغل گیر ہو رہا تھا تو کمرے کی مدّھم روشنی میں دیوار پر پڑنے والے چار سائے اللہ کی بارگاہ میں جُھکے جا رہے تھے۔

جواب نرالا سوال

9 + 6 − 3 = 12	9 × 6 + 3 = 57
9 − 6 ÷ 3 = 1	9 × 6 − 3 = 51
9 − 6 × 3 = 9	9 × 6 × 3 = 162
9 − 6 + 3 = 6	9 + 6 × 3 = 45
9 + 6 + 3 = 18	9 + 6 ÷ 3 = 5

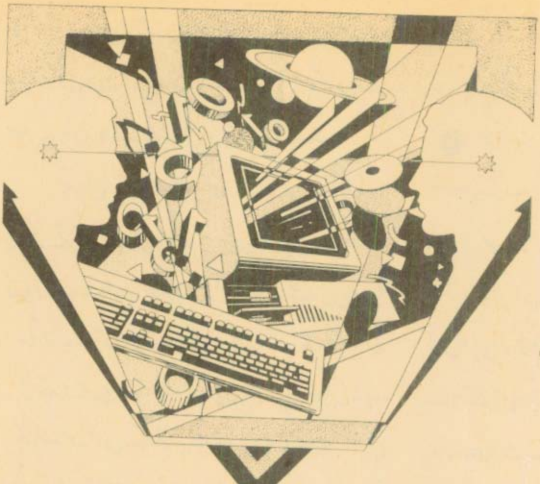

سائنس انکوائری

سائنسی موضوعات پر
آپ کے سوالات اور ان کے جوابات

سید ایاز محمود

● بائی پاس کے متعلق تفصیل سے بتا دیجئے کیا یہ دل کا کوئی آپریشن ہے؟

بدر منیزہ - لیاقت آباد کراچی

بائی پاس، عرفِ عام میں دل کے آپریشن کے ذریعے ایک خاص طریقۂ علاج کو کہتے ہیں۔

انسانی جسم میں دل کی حیثیت ایک پمپ کی ہے جو مستقل طور پر جسم کو خون کی فراہمی جاری رکھتا ہے بعض اوقات دل کو خون فراہم کرنے والی نالی اندر سے اتنی تنگ ہو جاتی ہے کہ خون کی آمد و رفت میں شدید رکاوٹ پڑنے لگتی ہے۔ اور یوں دل کے دورہ کا امکان ہر وقت موجود رہتا ہے

ڈاکٹر صاحبان ایک خاص عمل کے ذریعے جسے اینجیو گرافی کہتے ہیں۔ مرض کی تشخیص کرتے ہیں جس کے بعد اگر ضرورت ہو تو بائی پاس آپریشن تجویز کیا جاتا ہے۔ اس آپریشن میں جسم کے دوسرے حصے سے نس حاصل کر کے اس کے دل میں اس طرح پیوند کاری کی جاتی ہے کہ دوران خون پُرانی تقریبًا بند شدہ شریانوں کے بجائے پیوند شدہ نس کے ذریعے رواں دواں ہو جائے۔

اس کی مثال اس طرح سے سمجھ لیجئے کہ مین روڈ کے بند ہونے کی صورت میں برابر سے ایک متبادل رستے کا انتظام اس طرح کیا جائے کہ ٹریفک کی آمد و رفت رواں دواں رہے۔ بائی پاس آپریشن میں پیوند شدہ نس خون کی آمد و رفت کے لئے ایک متبادل رستہ ہی تو ہے۔ بائی پاس آپریشن طبِّ جدید کا ایک اہم ترین کارنامہ ہے۔

● پسینہ کیوں اور کیسے آتا ہے؟

محمد خالد اکرم کمبری ھنسو ہائی اسکول۔ ملتان

کڑاکے کی سردی ہو یا چلچلاتی گرمی۔ انسانی جسم کی خصوصیت ہے کہ وہ موسمی اور دیگر بیرونی حالات

کا اثر قبول نہیں کرتا اور برابر ایک اوسط درجہ حرارت برقرار رکھتا ہے۔ ایک تندرست انسانی جسم کا درجۂ حرارت ۹۸۶۶ درجے فارن ہائیٹ ہوتا ہے۔

سردی کے موسم میں ہمارے جسم اضافی گرمائش پیدا کرتے ہیں۔ اور گرم موسم میں پسینہ پیدا کرنے والے غدود جسم کے درجۂ حرارت کو معتدل رکھنے میں بڑی مدد کرتے ہیں۔ یہ غدود ہماری جلد کے اندر لاکھوں کی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ پسینہ جلد میں باریک باریک سوراخوں کے ذریعے خارج ہوتا ہے جنہیں مسامات کہتے ہیں۔ پسینہ خارج ہونے کے ساتھ ساتھ سوکھتا رہتا ہے اور تبخیر کا یہ عمل ہمیں ٹھنڈک کا احساس بخشتا ہے

آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ زیادہ مرطوب ماحول میں جہاں ہوا میں نمی کا تناسب معمول سے زیادہ ہو پسینہ آسانی سے خشک نہیں ہو پاتا اور ہمیں گرمی کی شدت زیادہ محسوس ہوتی ہے۔ اسی لئے گرمیوں میں نائلون اور دیگر مصنوعی ریشوں سے بنے ہوئے چست ملبوسات کے بجائے ڈھیلے ڈھالے سوتی کپڑے زیادہ آرام پہنچاتے ہیں۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ نائیلون اور مصنوعی ریشوں سے بنے ہوئے کپڑے پسینہ جذب نہیں کرتے جبکہ سوتی کپڑے اس عمل کو بخوبی انجام دیتے ہیں۔

گرم موسم میں دوڑ بھاگ اور محنت مشقت کا کام کرنے سے بہت زیادہ پسینہ آتا ہے اور جسم میں پانی اور نمکیات کی کمی واقع ہو جاتی ہے۔ یہ کمی ہماری صحت کے لئے بہت نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے۔ چنانچہ گرمیوں میں پانی خوب پینا چاہیئے۔

● قوس قزح شام کے وقت ھی کیوں بنتی ھے دوپہر کے وقت کیوں نہیں بنتی ؟

محمد ظفر اللہ ضیاء۔ بکالیہ

بھائی آپ نے یہ عجیب سوال پوچھا۔ ہم نے تو خود قوس قزح کو شام کے علاوہ یعنی صبح، دوپہر اور سہ پہر کے وقت بھی دیکھا ہے اور ہمیں یقین ہے کہ یہ بات ہمارے بہت سے پڑھنے والوں کے مشاہدے میں بھی ہوگی۔

قوس و قزح یا دھنک کا اصول بہت سادہ ہے بارش کے بعد جب دھوپ نکلتی ہے تو اس کی شعائیں فضا میں موجود بارش کے قطرات میں سے گزر کر سات مختلف رنگوں میں تقسیم ہوجاتی ہیں اور یوں ہم قوس و قزح کے دلکش نظارے سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

سائنس کے طلبا نے اسکول میں وہ تجربہ تو ضرور کیا ہوگا جس میں روشنی کو ایک خاص قسم کی بناوٹ والے شیشے یعنی منشور PRISM سے گزارتے ہیں تو وہ سات رنگوں میں تقسیم ہوجاتی ہے۔ یہ روشنی کا اصول ہے ہم آپ کو پہلے بھی بتا چکے ہیں کہ روشنی سات رنگوں سے مل کر بنتی ہے۔

بارش کے بعد فضا میں موجود پانی کے قطرے روشنی کے لئے منشور کا کام کرتے ہیں اور یوں سورج کی روشنی قوس و قزح کی شکل میں نظر آتی ہے۔

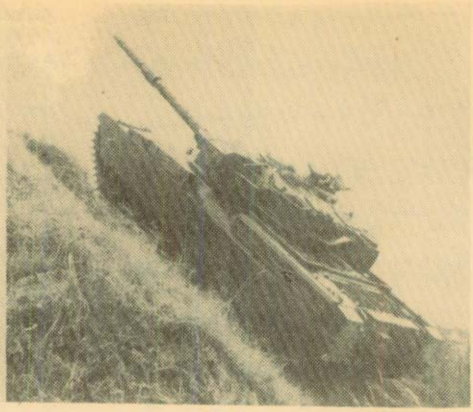

● ٹینک کس اصول کے تحت کام کرتا ہے ۔
اِسے کس نے ایجاد کیا ؟ وقاص اکرم، سنجوال

جیسا کہ سب کو پتا ہے کہ ٹینک ایک محفوظ ترین بکتر بند گاڑی ہے جو فوجی مقاصد کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ ٹینک کا جسم موٹی فولاد کی چادروں سے ڈھکا ہُوا ہوتا ہے۔ اُس کے پہیّوں پر زنجیر چڑھی ہوئی ہوتی ہے جسے انگریزی میں کیٹر پیلر کہتے ہیں۔ کیٹرپیلر کا فائدہ یہ ہے کہ ٹینک نہایت دشوار گزار راستوں پر بہ آسانی سفر کرتا ہے اور چھوٹی موٹی رکاوٹوں، ٹیلوں، ندی نالوں کی پرواہ نہیں کرتا۔

جہاں تک اس کی ایجاد کا تعلّق ہے تو یہ ایک برطانوی ایجاد ہے۔ خندقوں اور خاردار تاروں کو عبور کرنے کے پیشِ نظر ۱۹۱۴ء میں برطانوی فوج کے ایک افسر کرنل ایل ڈی سوئنٹیس نے سب سے پہلے ایک ایسی گاڑی کا تصور پیش کیا جو چاروں طرف سے نہ صرف محفوظ ہو بلکہ دشمنوں کی صفوں میں گھس کر اس کو تہہ و بالا کر دے۔ مختلف تجربات اور مشقوں کے بعد اُسے پہلی مرتبہ میدانِ جنگ میں لایا گیا جہاں اُس نے خاطر خواہ نتائج حاصل کیے۔ یہ پہلی جنگِ عظیم کا ذکر ہے۔

نہایت بھاری بھرکم ہونے کی وجہ سے اس کی رفتار کچھ زیادہ نہیں ہوتی۔ جرمنی کا بنا ہُوا ٹینک لیپرڈ-۲، زیادہ سے زیادہ ۶۸ کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے چل سکتا ہے لیکن یہ بے پناہ قوت کا حامل ہوتا ہے۔

● کھمبی کسے کہتے ہیں ؟ (محمد اسحاق، کوئٹہ)

یہ ایک قسم کا چھتری نما پودا ہوتا ہے جو عام طور پر برسات کے موسم میں خود بخود اُگ آتا ہے۔ اس کی ایک قسم کھائی جاتی ہے۔ جبکہ دوسری قسم نہیں کھائی جاتی۔ کھمبی کا بڑا حصّہ کسی جال کی طرح زمین کے نیچے غذا حاصل کرنے میں مصروف رہتا ہے۔ جبکہ باہر کا حصّہ تہہ در تہہ دھاگوں کی ایک چھتری سی بَن جاتی ہے۔ بعض ممالک میں باقاعدہ طور پر کھمبیوں کی کاشت بھی کی جاتی ہے۔

● جس شخص کو زیادہ نیند آئے اُس میں آکسیجن کی کمی ہوتی ہے۔ کیا یہ بات درست ہے؟ اگر ایسا ہے تو اس کمی کو کیسے دُور کیا جاسکتا ہے۔ (امینہ رفیق فیصل آباد)

سونے سے بھلا جسم میں آکسیجن کی کمی کیسے واقع ہو سکتی ہے؟ آکسیجن تو ہم اپنے اردگرد کی فضا سے حاصل کرتے ہیں اور نیند کی حالت میں بھی ہمارے پھیپھڑے برابر اپنا کام کئے جاتے ہیں۔

نیند تو ہمارے لئے بہت ضروری ہے۔ اسی دوران ہمارے جسم میں موجود لاکھوں خلیے جو دن بھر کے کام کاج اور محنت مشقت سے ٹوٹ پھوٹ جاتے ہیں۔ نئے ہو جاتے ہیں۔ جسم اپنے زہریلے اور فاسد مادّے خارج کر دیتا ہے۔ اور صبح ہم تر و تازہ ہو کر بیدار ہوتے ہیں۔ نیند کے دوران ہماری بیشتر سرگرمیاں موقوف ہوتی ہیں اور اسی لئے ہمارے جسم کو نسبتاً کم آکسیجن کی ضرورت پڑتی ہے۔

بچّوں کو بڑوں کی نسبت زیادہ نیند کی ضرورت ہوتی ہے۔ بڑوں کے لئے چھ سے آٹھ گھنٹے کی نیند کافی ہوتی ہے لیکن یہ کوئی کلیہ نہیں۔ کچھ لوگ چھ گھنٹے سے کم سو کر بھی ہشّاش بشّاش بیدار ہوتے ہیں۔

نیند سے بیدار ہونا ایک قدرتی عمل ہے۔ لیکن ضرورت سے زیادہ سونا اور نیند کو اپنے اوپر مسلّط کئے رکھنا طبّی نقطۂ نظر سے درست نہیں۔ سُستی اور کاہلی کی وجہ سے دیر تک بستر پر پڑے رہنا دراصل جسم کو تھکا دینے والا عمل ہے۔ بہتر یہی ہے کہ جلدی سونے اور جلدی اُٹھنے کی عادت کو اپنایا جائے۔

● سمندر میں آتش فشاں کس طرح لاوا اُگلتے ہیں۔ سمندر میں لاوا کہاں بنتا ہے اور کیا صورت اختیار کر لیتا ہے؟ (اُمّ کلثوم۔ ڈرگ کالونی، کراچی)

آپ نے بہت دلچسپ سوال کیا ہے۔ جی ہاں! خشکی کی طرح زیرِ سمندر بھی آتش فشاں پہاڑی سلسلے پائے جاتے ہیں۔ یہ سلسلے خاص طور پر بحرِ اوقیانوس بحرالکاہل اور بحرِ روم میں موجود ہیں۔ یہ لاوا بھی اُگلتے ہیں جو کہ بعض اوقات جَم کر چھوٹے چھوٹے نئے جزیروں کی بُنیاد رکھ دیتا ہے۔

زمین پر آتش فشاں پہاڑوں کے برخلاف زیرِ

سمندر میں آتش فشاں کی صورت ایک ماہر کی نظر میں

سمندر آتش فشاں انسانوں کے لئے زیادہ تباہی کا باعث نہیں بنتے ۔ ایک وجہ تو صاف ظاہر ہے کہ خشکی کی نسبت سمندروں میں انسان کم کم ہی پائے جاتے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ سمندر کا پانی آتش فشانی کا جانی دشمن ہے اور ہمیشہ اُسے نیست و نابود کر دینے کے درپے رہتا ہے ۔ البتہ کبھی کبھار یہ تباہی کا سبب بھی بن جاتے ہیں۔ مثلاً ۲۴، ستمبر ۱۹۵۲ء کو ایک جاپانی جہاز بھک سے اُس وقت اُڑ گیا جب وہ سمندر میں ڈوبے ہوئے آتش فشاں پہاڑ کے دہانے کے اوپر سے گزر رہا تھا۔ اس جاپانی جہاز کا نام "کیومارو" تھا ۔ اور تباہی پھیلانے والا آتش فشاں کہیں اور نہیں جاپان کے شہر ٹوکیو سے ڈھائی سو میل دُور بحرالکاہل میں تھا۔

● جب کوئی تُرش چیز یا دُھواں ہماری آنکھوں کو لگتا ھے تو ھماری آنکھوں سے پانی نکلنے لگتا ھے۔ اس کی وجہ بیان کریں؟ (قلب عباس گیلانی، پسرور)

دھویں یا تُرش چیز پر ہی کیا موقوف، آنکھ میں کوئی چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی چلی جائے تو سخت جلن ہوتی ہے اور پانی رواں ہو جاتے ہیں۔ آنکھ سے نکلنے والا پانی سادہ پانی نہیں ہوتا بلکہ یہ نمکیات اور جراثیم کش مادوں پر مشتمل ایک محلول ہوتا ہے ۔ آنکھ میں موجود آنسو پیدا کرنے والے غدود ہمہ وقت کام میں مصروف رہتے ہیں۔ اور یوں ہماری آنکھیں ہر وقت تر رہتی ہیں۔ پلکیں جھپکانے کا عمل جو لاشعوری طور پر سرزد ہوتا ہے۔ دراصل آنکھوں کے صفائی کے لئے وائپر Wiper کا کام کرتا ہے ہمارے پلک جھپکتے ہی آنکھ کا پپوٹا تیزی کے ساتھ نیچے اُوپر ہوتا ہے اور ہماری آنکھ میں پائی جانے والی اس کثافت کو صاف کر دیتا ہے جو عام طور پر ماحول میں موجود ہوتی ہے ۔ پپوٹے کی اندرونی سطح اور آنکھ کی جھلی کے درمیان جراثیم کُش پانی ہمیشہ موجود رہتا ہے اور اس سارے عمل میں آنکھ جیسی نازک شے کو رگڑ سے محفوظ رکھتا ہے ۔

مختصراً یہ کہ آنکھ کا یہ خودکار میکنزم ہر قسم کی بیرونی کثافتوں اور نقصان پہنچانے والے مادوں کا مقابلہ کرتا ہے ۔ بہت زیادہ رنج اور خوشی کی کیفیت میں بھی بے اختیار آنسو نکل پڑتے ہیں۔ یہ ایک قُدرتی عمل ہے ۔

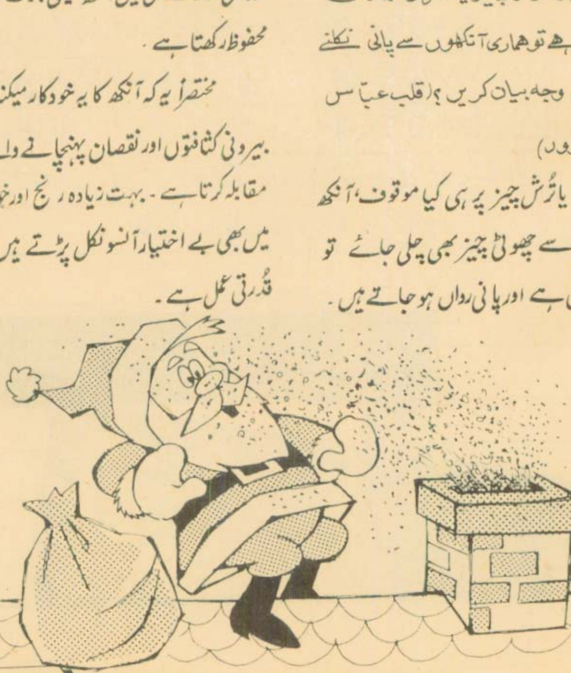

علم و ادب کے فروغ میں جو ادارے "آنکھ مچولی" سے تعاون کر رہے ہیں، ان کی تعداد بے شمار ہے۔ اس صفحے پر ہم صرف اُن بڑے ایجنٹس کی فہرست دے رہے ہیں، جن کی کوششوں سے ماہنامہ آنکھ مچولی پاکستان کے دُور دراز علاقوں تک بڑی تعداد میں پہنچتا ہے۔

آنکھ مچولی کے ایجنٹس

پاکستان بھر میں

محمد حسین برادرز۔ کراچی فون:۔ ۷۲۳۹۵۵	پاکستان اسٹینڈرڈ بک اسٹال۔ سرگودھا فون:۔ ۶۲۹۵۱
سلطان نیوز ایجنسی۔ لاہور فون:۔ ۵۸۲۴۹	کیپٹل نیوز ایجنسی۔ بہاولپور فون:۔ ۲۹۵۷
ملک تاج محمد صاحب۔ راولپنڈی فون:۔ ۵۵۴۳۲۱ / ۸۴۷۹۸۶	طاہر نیوز ایجنسی۔ جہلم فون:۔ ۰۵۹۴۱
مہران نیوز ایجنسی۔ حیدر آباد فون:۔ ۲۰۱۲۸	چوہدری امانت علی اینڈ سنز۔ رحیم یار خان فون:۔ ۲۶۲۶
افضل نیوز ایجنسی، چوک یادگار، پشاور فون:۔ ۶۲۵۱۵ / ۶۲۷۵۱	وہاڑی نیوز ایجنسی۔ ریل بازار وہاڑی
اے ایس حامد نیوز پیپر سروس، ملتان فون:۔ ۴۳۳۱۰ / ۴۱۷۵۷	اسلم نیوز ایجنسی۔ اخبار گھر۔ گوجرانوالہ
فیاض بک ڈپو۔ فیصل آباد فون:۔ ۲۷۴۰۶	اشرف نیوز ایجنسی۔ بالمقابل جی ٹی ایس بس اسٹینڈ۔ اوکاڑہ
سعید بک اسٹال۔ گجرات فون:۔ ۰۴۳۳۱	مسلم بک ڈپو۔ سرائے عالمگیر
سلمان برادرز۔ نواب شاہ فون:۔ ۲۴۱۴	

رسالہ نہ پہنچنے کی صورت میں یا بروقت نہ ملنے پر مندرجہ ذیل پتے پر خط لکھئے

سرکولیشن منیجر
"ماہنامہ آنکھ مچولی" ڈی ۱۱۲، نورس روڈ، سائٹ کراچی ۱۶

کیٹی تم کہاں ہو؟

ڈونا کینی
سیّد خورشید عالم

ایک بچّے اور بلّی کی کہانی جو بچھڑ گئے تھے۔

میس نے باورچی خانے کی کھڑکی سے اپنے بیٹے ٹونی کو جاتے ہوئے دیکھا۔ اُس نے اسکول کا بستہ اپنے کندھے سے لٹکایا ہوا تھا۔ اُس کے کندھے جُھکے ہوئے تھے اور وہ بڑی بے دلی سے بھاری قدموں سے گری ہوئی برف کی موٹی سی تہہ پر چلا جا رہا تھا۔ دس روز پہلے اُس کی انتہائی چہیتی بلّی "کیٹی" گم ہو گئی تھی۔ جب سے ٹونی یونہی کھویا کھویا رہنے لگا تھا۔ ہمارا گھر قریبی قصبے سے کچھ فاصلے پر تھا۔ ہمارے گھر کے چاروں طرف وسیع میدان تھا۔ جہاں سارا سال برف کی موٹی سی تہہ اپنی بہار دکھاتی رہتی۔ میدان میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر خودرو جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔

میرا اور میرے شوہر بل، دونوں کا خیال تھا کہ کیٹی برف کے طوفان میں راستہ بھُول جانے سے برف میں دب کر ہلاک ہو گئی ہے۔ یا پھر قصبے کی مرکزی شاہراہ پر کسی گاڑی کے نیچے آ کر کچلی گئی ہے۔ مگر ٹونی اس بات

کو ماننے کے لئے تیار ہی نہ تھا کہ کیٹی کو کوئی حادثہ پیش آیا ہے۔

"امّی! آپ اور ڈیڈی ایسا کیوں سمجھتے ہیں کہ کیٹی کسی حادثے کا شکار ہو گئی ہے"۔ ٹونی نے ایک روز مجھ سے سوال کیا۔ میں نے اُس کی آنکھوں میں تیرتی نمی دیکھ لی تھی۔ مجھ سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ تو میں نے اُسے لپٹا لیا۔ میں نے سوچا کہ اس سے کہوں کہ وہ کوئی دوسری بلی خرید کر لے آئے۔ مگر میں کچھ نہ کہہ سکی۔ آج سے چار سال قبل جب ٹونی صرف دس برس کا تھا تو میرے شوہر ایک دن دفتر سے واپسی پر سیاہ اور سفید بالوں سے ڈھکی ہوئی ایک بلّی لے آئے۔ انہوں نے آتے ہی اُسے ٹونی کو تھما دیا۔ پہلے پہل تو اس نرم و نازک سی بلی کو گیراج میں رکھا گیا مگر ایک رات میں نے دیکھا کہ وہ ٹونی کے بستر پر اس کی پائنتی پر کمبل میں گھُسی آرام سے سو رہی ہے۔ دونوں کی دوستی دیدنی تھی۔ اسکول سے جونہی ٹونی واپس آتا۔ سب سے پہلے کیٹی ہلکی سی "میاؤں" سے اس کا استقبال کرتی تھی۔ جب تک ٹونی اپنا ہوم ورک کرتا رہتا وہ اُس کے پیروں میں بیٹھی اپنی دُم ہلاتے ہوئے اُسے غور سے... دیکھتی رہتی۔

ان دس دنوں میں بھی ٹونی اپنے معمول کے مطابق اسکول جاتا۔ اسکول سے واپس آکر وہ اپنا ہوم ورک مکمّل کرتا۔ مگر میں دیکھ رہی تھی۔ کہ وہ چپ چپ رہنے لگا ہے۔ وہ ہر آہٹ پر یوں چونک پڑتا جیسے کیٹی واپس آگئی ہو۔ کل اتوار کا دن تھا۔ ہم لوگ عبادت کے لئے گئے۔ ہم سب دُعا سے فارغ ہو چکے تھے۔ مگر ٹونی کافی دیر تک دو زانو جھکا کیٹی کی خیریت سے واپسی کی دُعا مانگتا رہا۔

دو بج چکے تھے۔ "اب تک ٹونی کو اسکول سے واپس آجانا چاہیئے"۔ میں نے سوچا۔ اتنے میں فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے جلدی سے بڑھ کر ریسیور اُٹھایا۔

"ہیلو! امّی میں ٹونی بول رہا ہوں۔ ایک شکاری یہاں قصبے میں کہہ رہا تھا کہ اُس نے ایک میل دُور جنگل کے قریب کسی بلّی کی آواز سنی ہے میں اُدھر ہی جا رہا ہوں مجھے یقین ہے کہ کیٹی زندہ ہے اور اس شکاری نے اُسی کی آواز سنی ہے"۔ میں سُن ہو کر رہ گئی۔

"بیٹا! موسم ٹھیک نہیں ہے اور اس طرف برفانی لومڑیوں کی بہتات ہے۔ تم ادھر مت جاؤ"۔ میں نے اُسے روکنا چاہا۔ مگر اُس نے فون بند کر دیا۔ میں نے عجلت میں اپنے شوہر کو فون کر کے ساری صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ انہوں نے کہا کہ وہ فوراً پہنچ رہے ہیں۔ ساتھ ہی انہوں نے مجھے قصبے کے شیرف کو فون کر کے مدد طلب کرنے کو کہا۔ ایک گھنٹے کے بعد شیرف بھی اپنے ماتحتوں کے ہمراہ ہمارے گھر پہنچ گیا۔ اس کے فوراً بعد ہی

میرے شوہر بھی پہنچ گئے۔ شیرف نے علاقے کا نقشہ دیکھا۔ میں نے اس کے چہرے پر تشویش کی لکیریں دیکھ لی تھیں۔ اس کی تشویش بجا تھی۔ میں جانتی تھی کہ اس علاقے سے بہت کم لوگ گزرتے تھے کیوں کہ برفانی لومڑیاں اکیلے انسان پر اکثر حملہ آور ہوجاتی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد ہی شیرف اپنے ماتحتوں کے ہمراہ جنگل کی طرف نکل گیا۔ میرے شوہر بھی اُن کے ساتھ تھے۔ اب میں گھر میں اکیلی رہ گئی تھی۔ میں دل ہی دل میں دُعا مانگ رہی تھی کہ ٹونی خیریت سے واپس آجائے۔ جوں جوں وقت گزرتا جارہا تھا میری پریشانی بھی بڑھتی جارہی تھی۔ تنہائی کی وجہ سے ٹونی کے بارے میں بُرے بُرے خیالات آنے لگے۔ میں گھبرا کر رونے لگی۔

"یااللہ ... میرے بیٹے کو اپنی حفاظت میں رکھنا وہ میرے گھر کی رونق ہے ... اس کی حفاظت کرنا۔"

مجھے نہیں معلوم کہ میں کتنی دیر تک دُعا مانگتی رہی۔ اتنے میں باہر شیرف کی گاڑی رُکنے کی آواز آئی۔

"میرا بیٹا آگیا ... میرا ٹونی آگیا۔" میں تیزی سے دروازے کی طرف لپکی۔ مگر یہ کیا!! شیرف اپنے ماتحتوں کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ ان کے پیچھے میرے شوہر سر جھکائے داخل ہوئے۔ تھکن ان کے چہروں سے عیاں تھی۔ میں ماں تھی۔ اس لئے بلند آواز سے رونے لگی۔ ٹونی کے والد نے اپنے جذبات چھپانے کے لئے اپنا چہرہ دوسری طرف کرلیا۔ میں روتی رہی۔ اتنے میں مجھے شیرف کی آواز سنائی دی وہ کہہ رہا تھا۔

"خاتون آپ اللہ پر بھروسہ رکھئے۔ ابھی جنگل کا مغربی حصّہ باقی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ٹونی اس طرف کیٹی کو تلاش کررہا ہو اب اندھیرا ہونے والا ہے۔ میں ابھی فون کرکے دوسری امدادی پارٹی بھی طلب کرتا ہوں۔ آپ فکر نہ کریں۔" شیرف نے قصبے میں امدادی پارٹی کو فون کرکے اُسے ہمارے گھر کا پتا سمجھایا۔ پھر اُس نے علاقے کا نقشہ کھولا۔ اور اس پر مختلف مقامات پر نشان لگانے لگا۔ ابھی شیرف نے نقشے پر سُرخ پینسل سے نشانات لگائے ہی تھے کہ دروازہ کھُلا۔ ہم سب دنگ رہ گئے۔ دروازے پر ٹونی کھڑا تھا۔ اُس نے اپنی گرم جیکٹ میں کیٹی کو اُٹھایا ہوا تھا۔ سردی کی وجہ سے ٹونی کے ہونٹ نیلے پڑچکے تھے اور چہرے پر خراشوں کے نشانات تھے۔ میں تیزی سے آگے بڑھی اور اُسے لپٹا لیا۔

مرہم پٹّی سے فارغ ہونے کے بعد ٹونی نے بتایا کہ وہ شکاری کی بتائی ہوئی جگہ پر پہنچ تو گیا مگر اُسے سوائے کہُرے کے کچھ نظر نہ آتا تھا۔ اُس نے ایک جھاڑی کی موٹی سی شاخ توڑلی تاکہ کسی لومڑی کے حملے کی صورت میں اپنا دفاع کرسکے۔

"میں دیوانوں کی طرح جھاڑیوں میں گھُس جاتا۔ مگر مجھے کیٹی کہیں نظر نہ آئی۔ بالآخر میں نے زور زور سے اُسے آواز دینا شروع کردیا۔ کیٹی ... تم کہاں ہو؟ میں آگیا ہوں ... کیٹی ... میں آگیا ہوں ... کیٹی ... کیٹی ... میں اُسے

آوازیں دیتا رہا۔ بالآخر کچھ دُور جھاڑیوں میں مجھے کیٹی کی آواز سنائی دی۔ میں تیزی سے اُس کی طرف بڑھا۔ جھاڑیوں کو ہٹایا تو میں نے دیکھا کہ کیٹی وہاں زخمی حالت میں موجود ہے۔ اس کے ایک پنجے پر گہرا زخم تھا۔ اس نے آس پاس کی برف کھا کھا کر اپنا گزارہ کیا تھا۔ چنانچہ میں نے جلدی سے اپنی جیکٹ اُتار کر کیٹی کو اس میں لپیٹا اور واپسی کا سفر شروع کر دیا۔" اس نے اپنی داستان ختم کی۔ تھوڑی دیر کمرے میں بالکل خاموشی طاری رہی۔ پھر اُس نے ہم میاں بیوی کو مخاطب کرکے کہا۔

"امی... ڈیڈی... میں نہ کہتا تھا کہ کیٹی زندہ ہے... میرا دل گواہی دیتا تھا کہ وہ زندہ ہے۔" ہم سب کیٹی کے لئے اس کی والہانہ محبت پر دنگ ہو کر رہ گئے تھے۔ تبھی شیرف ہلکے سے آگے بڑھا اور اُس نے ٹونی کے بالوں کو بوسہ دیتے ہوئے کہا۔

"آج کے اس دور میں جبکہ ہر طرف نفسا نفسی کا عالم ہے۔ میں ایک بلی کے لئے تمہاری بے پایاں محبت دیکھ کر بہت متاثر ہُوا ہوں بیٹے! مجھے یوں لگتا ہے کہ آگے چل کر تم یقیناً نام کماؤ گے۔" پھر شیرف نے ہم میاں بیوی کو مخاطب کرکے کہا۔

"آپ لوگ یقیناً مبارک باد کے مستحق ہیں کیونکہ آپ کی محبت اور تربیت نے ٹونی کے دل میں ایک جانور کے لئے ایسی محبت پیدا کر دی۔ ہم میں سے ہزاروں بلکہ لاکھوں افراد کو ٹونی سے سبق حاصل کرنا چاہیئے۔ جو جانوروں سے تو درکنار انسانوں سے بھی پیار نہیں کرتے۔" اس نے ایک بار پھر ٹونی کو پیار کیا اور اپنے ماتحتوں کے ساتھ باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر تک کمرے میں خاموشی رہی۔ پھر ٹونی آہستہ سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُس نے بڑی احتیاط سے کیٹی کو اُٹھایا اور یہ کہہ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا کہ۔

"چلو کیٹی۔ میں تمہیں تمہارے بستر پر آرام سے سلا دوں۔ پھر میں ہوم ورک کر کے خود بھی آرام کروں گا... کیوں ٹھیک ہے نا؟" کیٹی نے اس کی بات کا جواب ہلکی سی میاؤں کی صورت میں دیا۔ ہم دونوں میاں بیوی اس کی معصومیت پر ہنس پڑے۔

ایک صاحب کا دعویٰ تھا کہ کوئی شخص کتنی ہی بلندی پر چڑھ جائے، وہ اُسے صرف تین لاتوں میں نیچے لا سکتے ہیں۔ ایک شخص نے ان کا یہ دعویٰ سنا تو وہ ایک اونچے درخت پر چڑھ گیا اور بولا۔

"لو اب مجھے نیچے اُتارو۔"

وہ صاحب درخت کے قریب آئے، درخت کو ایک لات رسید کی اور واپس جانے لگے، اُس شخص نے چلا کر کہا۔

"ابھی دو لاتیں باقی ہیں؟"

اُن صاحب نے اپنا رُخ درخت کی طرف کیا اور بولے "دوسری لات ایک سال بعد اور تیسری دو سال بعد ماروں گا۔" محمد جاوید۔ نئی کراچی

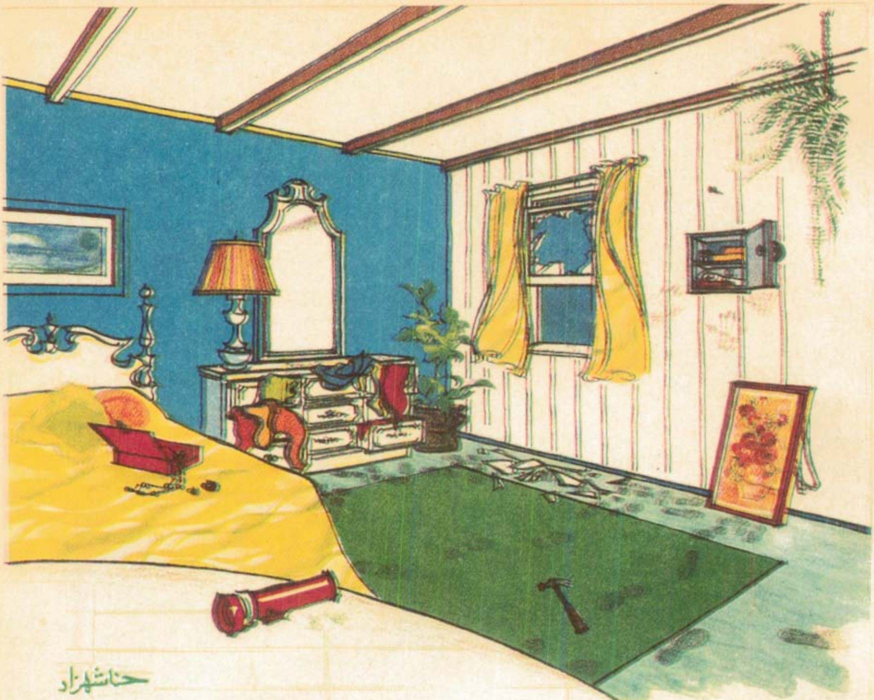

جرم کیسا؟ مجرم کون؟

اس کمرے میں کوئی جرم وقوع پذیر ہوا ہے ۔ کمرے کو نہایت غور سے دیکھئے اور اس صفحے پر دیے گئے سوالات کے جوابات دیجئے ۔ اپنے جوابات کو نشان زد کیجئے ۔ (کچھ سوالات کے ایک سے زیادہ درست جوابات ہیں ۔)

۱ ۔ اس کمرے میں کون سا جرم وقوع پذیر ہوا ہے ؟
(ا) مصنوعی چوری (ب) نقب زنی (ج) قتل

۲ ۔ آپ جرم کی شہادت کہاں تلاش کریں گے ؟
(ا) کمرے کے اندر (ب) کمرے کے باہر (ج) دونوں جگہوں پر

۳ ۔ اس جرم میں کون کون سی گھریلو اشیاء استعمال کی گئی ہیں ؟
(ا) ہتھوڑا (ب) دستانے (ج) چمٹا (د) فلیش لائٹ (ر) ان میں سے کوئی بھی نہیں ۔

۴ ۔ اس کمرے میں کس چیز کو چھوا گیا ؟
(ا) مصنوعی پودے (ب) میز (ج) سیف کے قریب واقع پودا (د) آئینہ (ر) سنگھار میز (س) کھڑکی کی چوکھٹ ۔

۵ ۔ آپ عدالت میں کس چیز کو شہادت کے طور پر استعمال کریں گے ؟
(ا) فلیش لائٹ (ب) زیورات کا بکس (ج) جوتوں پر لگی مٹی (د) ہتھوڑا (ر) یہ تمام چیزیں ۔

۶ ۔ آپ کس چیز کو شہادت کے طور پر استعمال نہیں کریں گے ؟
(ا) ٹوٹا ہوا شیشہ (ب) پردے (ج) انگلیوں کے نشانات

۷ ۔ کمرے میں کتنے مجرم داخل ہوئے تھے ؟
(ا) ایک (ب) دو (ج) دو سے زیادہ (د) کچھ کہہ نہیں سکتے ۔

۸ ۔ کیا مجرم یا مجرمین کو معلوم تھا کہ سیف کہاں ہے ؟
(ا) ہاں (ب) نہیں (ج) کہہ نہیں سکتے ۔

ہے یہ خبر یقیناً سو فی صدی غضب کی
کُتّے بھی کھیلتے ہیں اب دوستو فرزبی

حارث شمیم

کُتّے کو دیکھتے ہی ہمیں پطرس بخاری مرحوم اور پھر اُن کا مشہورِ زمانہ مضمون "کُتّے" یاد آجاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ پطرس نے "کُتّے" کے موضوع پر مضمون لکھ کر قلم توڑ دیا تھا اور پھر دوبارہ کبھی قلم کو جڑوانے یا دوسرا قلم خریدنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔۔۔

تاہم یہ ذرا پرانے زمانے کی بات ہے۔ پطرس اگر آج زندہ ہوتے تو وہ یقیناً یا تو اپنا قلم جڑواتے یا پھر نیا قلم خرید کر کُتّے پر ایک اور مضمون لکھتے۔ اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ پطرس نے اپنے مضمون میں کُتّوں کی جتنی اقسام۔ بیان کی ہیں ان کے علاوہ کُتّوں

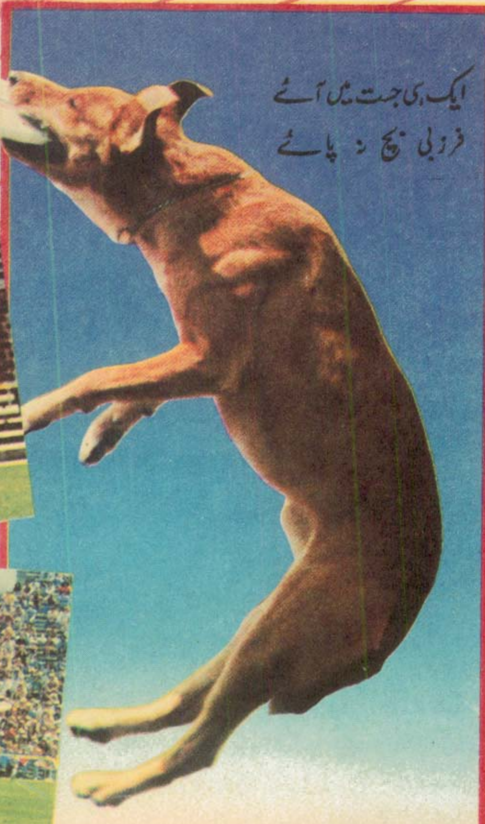

فرزبی کے مقابلے میں دو چیمپئن کُتّوں کے بھرپور ایکشن

کی اب ایک اور قسم بھی وجود میں آگئی ہے ۔ کھلاڑی کُتوں کی ۔ دوسرے بہت سے عجوبوں کی طرح یہ کتے بھی امریکہ میں پلائے جاتے ہیں ۔ یہ فرزبی کھیلتے ہیں ۔

ہر سال موسمِ بہار میں جب امریکہ میں انسانوں کی فرزبی کے عالمی مقابلے منعقد ہوتے ہیں تو اُس وقت کُتوں کے مقابلے بھی منعقد ہوتے ہیں ۔ ان مقابلوں میں امریکہ کی تمام ریاستوں سے منتخب شدہ کتے حصّہ لیتے ہیں ۔ ان مقابلوں کو ہر سال ۵۰ ، ہزار تماشائی دیکھتے ہیں ۔ ان مقابلوں کے دو حصّے ہوتے ہیں ۔

پہلے حصّے میں فرزبی کو کم از کم ۱۵ ، میٹر کے فاصلے پر پھینکا جاتا ہے ۔ کھلاڑی کتا اس فرزبی کو دو منٹ کے اندر اندر جتنی بار اُٹھا کر لاتا ہے اُسے اُتنے ہی نمبر ملتے ہیں ۔ دوسرے حصّے میں فرزبی کو اُونچا اُچھال کر کُتّے سے اُسے کیچ کرایا جاتا ہے ۔ بعض کُتّے فرزبی کو کیچ کرنے کے لئے آٹھ میٹر تک اُونچا اُچھل جاتے ہیں ۔

معلوم نہیں امریکی کُتوں کے اس نئے شغل پر ہمارے کُتوں کا ردِّ عمل کیا ہے ۔ ہم نے ایک کُتّے سے پوچھنے کی کوشش کی تھی اور اپنی قمیص کے ایک کونے سے محروم ہو گئے تھے ۔ آپ ذرا بنیان وغیرہ پہن کر معلوم کرنے کی کوشش کیجئے ۔ شاید کامیابی آپ کے قدم چُومے ۔

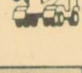

پرندوں کو نہ ماریئے

پرندے ہماری کائنات کا حُسن ہیں

پرندے نظامِ حیات کا جزوِ لازم ہیں

انہیں نہ ماریئے

انہیں ان کی فطری عمر تک جینے کا حق دیجیے

ادارہ آنکھ مچولی

آیئے!

بڑوں کو سمجھائیں سگریٹ نہ سلگائیں

سگریٹ وہ غیر محسوس زہر ہے جو ہماری زندگی کو گھن کی طرح چاٹ جاتا ہے اور بالآخر موذی امراض اور تکلیف دہ موت کے انجام سے دوچار کرتا ہے۔

سگریٹ نشہ ہے جو ہم سے ہماری فعال اور متحرک زندگی چھین کر ہمیں سستی، کاہلی اور بے ہمتی کے روگ دیتا ہے۔

سگریٹ وہ لت ہے جو مضبوط ارادوں اور آہنی عزائم کے قلعوں کو مسمار کر دیتا ہے۔

سگریٹ پینے والے کبھی شاھین صفت نھیں ھو سکتے سگریٹ کا دھواں نگلنے والے ہمیشہ صحت مند نہیں رہ سکتے۔

یاد رکھیے ہمارے اطراف جب کوئی سگریٹ پی رہا ہوتا ہے تو اُس کا دھواں اُسی کی رگوں میں اندھیرے نہیں بھرتا بلکہ ہماری سانسوں میں شامل ہوکر ہماری رگ و پے میں بھی اُترتا ہے۔ **توپھر ـــــ ھم احتجاج کیوں نہ کریں** سگریٹ پینے والے اپنے بزرگوں کو کیوں نہ سمجھائیں کہ سگریٹ انہی کی نہیں ھماری بھی قاتل ہے۔ اچھے لہجے میں، شائستہ طریقے سے مہذب بچّوں کی طرح... آیئے اپنے بڑوں کے ہاتھ سے سگریٹ لے کر پھینک دیں اور ان کی درازیٔ عمر کی دعائیں مانگیں آنکھ مچولی کی "سگریٹ چھوڑ تحریک" میں شامل ھو کر اسے موثر بنائیے۔

وزارت صحت اسلام آباد کو بھی آپ سب خط لکھئے کہ حکومت سگریٹ کے اشتہارات پر پابندی لگا دے۔
قومی صحت کو تباہ کرنے والے اشتہارات پر پابندی بھی ضروری ہے۔

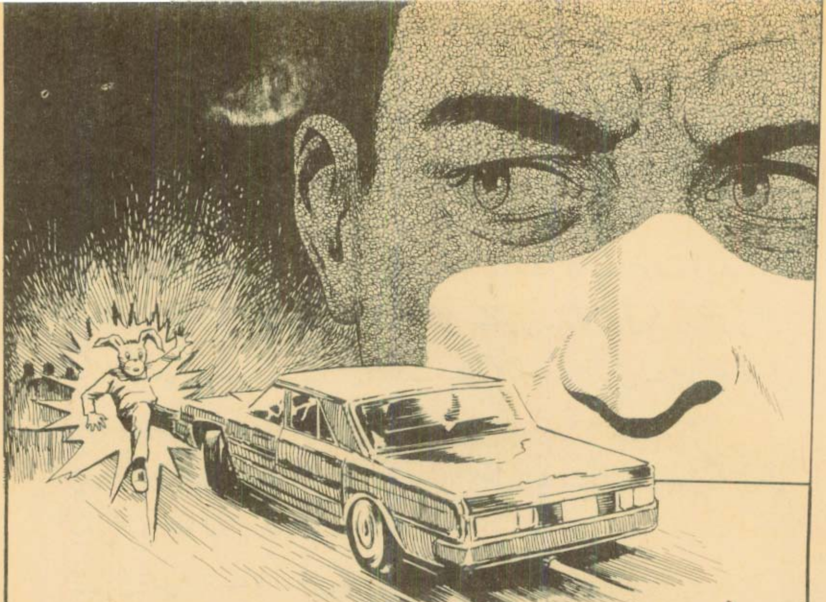

خمیازہ

عمران مشتاق

وہ کافی تیز رفتاری سے گاڑی چلا رہا تھا۔ جیسے ہی اُس نے تیزی سے موڑ کاٹا بچہ اتنا اچانک گاڑی کے سامنے آیا کہ وہ کچھ نہ کر سکا اور بچہ گاڑی کے بمپر سے زور سے ٹکرایا۔ ٹکر اتنی شدید تھی کہ بچہ اُڑ کر فٹ پاتھ پر گرا۔ اُس نے گاڑی فوراً روک لی۔ بچہ شاید کسی فینسی ڈریس شو سے آرہا تھا کیونکہ اُس نے خرگوش کا ماسک پہن رکھا تھا۔ اُس نے دیکھا کئی فینسی ڈریس میں ملبوس بچے زخمی بچے کی طرف دوڑ پڑے۔ کچھ دوسرے لوگ بھی بچے کی طرف لپکے۔ وہ ابھی گاڑی سے نکلنے کی سوچ ہی رہا تھا کہ اُس نے سُنا کچھ لوگ چلا رہے تھے۔ کہ "گاڑی والے کو پکڑو یہ بچے کو مار کر بھاگ رہا ہے" یہ سُننا تھا کہ اُس نے ایک جھٹکے سے گاڑی آگے بڑھادی۔ بیک مرر میں دیکھنے سے اطمینان ہوا کہ پیچھے کوئی گاڑی نہیں تھی۔ یہ ایک سنسان روڈ تھا۔ وہ گاڑی کی رفتار بڑھاتا چلا گیا۔

"تمہیں ایک بچے کو زخمی کر کے بھاگنا نہیں چاہیئے تھا" اُس کے اندر سے جیسے کسی نے سرگوشی کی۔

"میں کیا کرتا۔ وہ لوگ مجھے مار دیتے" اس کی خوفزدہ سوچ نے کہا۔

"اُس بچے کو فوراً طبی امداد کی ضرورت تھی تمہیں اُسے اسپتال لے جانا چاہیے تھا۔"

"میں خود یہ ہی چاہتا تھا لیکن میری طرف بڑھتے ہوئے لوگوں کے تیور دیکھ کر مجھے مجبوراً بھاگنا پڑا۔" اُس نے خود کلامی کے لہجے میں کہا۔

"تمہیں گاڑی آہستہ چلانا چاہیئے تھی اگر تم گاڑی مناسب رفتار سے چلا رہے ہوتے تو یہ حادثہ نہ ہوتا۔"

"اُس سڑک پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے اسی لئے میں نے گاڑی کی رفتار کم نہیں کی۔"

"اگر اُس سڑک پر ٹریفک کم ہوتا ہے تو اس کا مطلب ہے تم گاڑی بے احتیاطی سے چلاؤ۔ تم نے وہاں اُس بچے کو مرنے کے لئے چھوڑ دیا۔ اگر وہ مر گیا تو پھر؟"

"نہیں وہ نہیں مر سکتا۔ کوئی نہ کوئی گاڑی والا اُسے ضرور اسپتال پہنچا دے گا۔" اُس نے خود کو تسلی دی۔

"اگر کوئی گاڑی والا نہ ملا تو پھر شاید بچہ مر جائے۔"

"نہیں کوئی نہ کوئی ضرور ملے گا۔ اگر نہ مل سکا تو؟" وہ تصوّر کر کے ہی کانپ گیا۔

"اگر وہ مر گیا تو اُس کی موت کے ذمّے دار تم ہوگے۔ تم قاتل بن جاؤ گے۔" ضمیر کے کچوکے ناقابلِ برداشت تھے۔

"نہیں میں اُسے مرنے نہیں دوں گا۔" اُس نے دُکھتے ہوئے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ اسٹیئرنگ پر سے ہاتھ ہٹنے کی وجہ سے گاڑی لہرانے لگی۔ اُس نے جلدی سے گاڑی کو سنبھال لیا۔ اب وہ گھر کے قریب پہنچ گیا تھا اُس نے گاڑی گیراج میں کھڑی کی اور گھر کے اندر داخل ہو گیا۔

"آج آپ نے گھر آنے میں دیر کر دی۔" اُس کی بیوی نے پوچھا۔

"آج آفس میں کام زیادہ تھا اس لئے دیر ہو گئی۔ میں اپنے کمرے میں جا رہا ہوں۔ مجھے کوئی ڈسٹرب نہ کرے۔" یہ کہہ کر وہ اپنے کمرے میں آ گیا۔

انسان جب تنہا ہو تو سوچیں یک دم یلغار کرتی ہیں۔ وہ بھی ان کی یلغار میں گھرا ہوا بے حد تھکن محسوس کر رہا تھا۔ اس نے سونے کی کوشش کی، لیکن جب ذہن پر بوجھ ہو تو نیند بھی روٹھ جاتی ہے۔ وہ اپنے آپ سے لڑتے لڑتے تھک چکا تھا۔ اندرونی کشمکش اب اضطراب میں ڈھل رہی تھی۔ وہ اپنے خیالات سے اُس وقت چونکا جب اُس کے کمرے کا دروازہ کھلا اور اُس کی بیوی اندر داخل ہوئی۔

"تھانے سے ایک سپاہی آیا ہے کہہ رہا ہے کہ آپ کو ایس ایچ او صاحب نے بلوایا ہے۔" وہ بولی۔

"مم... مم... مجھے... مم... مگر میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔" وہ ہکلایا۔

"ارے آپ تو ایسے ڈر رہے ہیں جیسے کوئی جُرم کر بیٹھے ہوں تھانے میں صرف مجرم ہی نہیں بلائے جاتے بلکہ کسی ضرورت کے تحت معزز شہریوں کو بھی بلوایا جا سکتا ہے۔ آپ تیار ہو جائیں۔ میں نے سپاہی

سے انتظار کرنے کو کہا ہے" وہ یہ کہہ کر واپس لوٹ گئی۔

"اتنی جلدی پولیس نے مجھے کیسے ڈھونڈھ لیا۔ کیا کسی نے میری گاڑی کا نمبر نوٹ کر لیا تھا۔ اب یہ مجھے گرفتار کر لیں گے۔ کیا مجھے بھاگ جانا چاہیے؟ مگر میں بھاگ کر کہاں جاؤں گا۔ بھاگنے سے میرا جُرم اور سنگین ہو جائے گا۔ پھر مجھے کیا کرنا چاہئے" اس وقت اُس کا دماغ مختلف خیالات کی آماجگاہ بن گیا تھا۔

"لیکن یہ سپاہی تو میرے علاقے کے تھانے سے آیا ہے اور ایکسیڈنٹ دوسرے علاقے میں ہُوا تھا۔ اس کا مطلب ہے ایس ایچ او نے کسی اور مقصد کے لئے بلوایا ہے۔ کیونکہ میرا شمار محلّے کے معزّز لوگوں میں ہوتا ہے اس لئے کوئی خاص بات پوچھنی ہوگی" اب اُسے کچھ تسلی ہوئی۔

سپاہی کے ساتھ جاتے ہوئے بھی اُس کا ذہن پریشان تھا اور وہ اندر سے سخت خوفزدہ تھا۔ تھانے میں ایس ایچ او کے ساتھ محلّے کے دو تین لوگ اور بھی تھے اُن سب سے اُس کے خوشگوار تعلّقات تھے۔

"اکبر صاحب! آپ کو تکلیف دینے کی معذرت چاہتا ہوں ایک شناخت کے سلسلے میں آپ کی ضرورت تھی" ایس ایچ او صاحب بولے۔

"میں حاضر ہوں، جیسے آپ کہیں" اب دل کو کچھ اطمینان مِلا تھا۔

"آپ میرے ساتھ آئیے" یہ کہہ کر ایس ایچ او صاحب دوسرے کمرے میں جانے لگے۔ وہ بھی دوسرے لوگوں کے ساتھ اُن کے پیچھے چلنے لگا۔

"اکبر صاحب آپ ذرا آگے آجائیں" ایس ایچ او صاحب نے ایک بینچ کے پاس رُکتے ہوئے کہا۔ وہ بینچ کے پاس پہنچ کر رُک گیا۔

"یہ ایکسیڈنٹ میں مرنے والے ایک بچّے کی لاش ہے۔ آپ ذرا شناخت کر لیجئے" یہ کہہ کر ایس ایچ او نے لاش کے چہرے پر سے چادر کھینچ لی۔ لاش کے چہرے پر نظر پڑتے ہی وہ جیسے پتھر کا ہو گیا۔ وہ اُس کے بیٹے فیصل کی لاش تھی۔ اُس کے ذہن میں جیسے آندھیاں سی چلنے لگیں۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہو۔ ذہن کے کسی گوشے میں اُس کی بیوی کے کہے ہوئے صبح کے الفاظ گونجنے لگے۔

"آج ہمارا فیصل فینسی ڈریس شو میں حصّہ لینے کے لئے جا رہا ہے۔ اُسے بڑی امید ہے کہ وہ انعام جیت کے آئے گا"

فیصل زندگی ہار کے آگیا تھا۔

مفلوج ہوتے ہوئے ذہن نے سُنا، کوئی کہہ رہا تھا۔

"اگر فیصل کو اسپتال لے جانے کے لئے فوراً گاڑی مل جاتی تو شاید اُس کی جان بچ جاتی"

سلسلے وار ناول
قسط نمبر ۴

ڈاڑیل

"دھاڑیل"
بہ معنی
"ڈاکو"

نعیم بلوچ

اٹھارہ سالہ جانو کو اپنی بیمار ماں کے علاج کے لئے وڈیرے سے رقم نہ مل سکی۔ گوٹھ کے ایک ہندو بیوپاری رام چند نے اُس کو ماں کے علاج کے لئے رقم بھی دی اور اُسے ملازمت دلانے کے لئے اپنی اوطاق پر بُلایا جانو جب وہاں پہنچا تو اُس نے تین افراد اور اپنے ہم عمر لڑکے منظور کو پہلے سے موجود پایا۔ تھوڑی دیر بعد جانو اور منظور کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر ایک جیپ میں بٹھا دیا گیا۔ اس کے بعد جیپ کسی نامعلوم جگہ کی طرف روانہ ہوگئی۔ انہیں اندازہ ہوچکا تھا کہ وہ ڈاکوؤں کے کسی گروہ میں شامل ہو چکے ہیں۔ ایک طویل سفر کے بعد وہ ایک پہاڑی غار میں پہنچا دیئے گئے۔ یہاں انہیں ڈکیتی کے لئے تیار ہونا پڑا۔ چند روز بعد انھوں نے رات کے تین بجے مرکزی شاہراہ پر مسافروں سے بھری ہوئی ایک بس کو رکاوٹیں کھڑی کر کے روک لیا۔ بس میں موجود پولیس کے دو مسلح سپاہی اور مسافر چونک پڑے۔ مگر وہ کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔

ڈاکوؤں نے بس کے تمام مسافروں کا اسباب لوٹ لیا اور ایک بوڑھے ہاری کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ جانو کو مسافروں سے ہمدردی اور ڈاکوؤں سے نفرت ہونے لگی تھی۔ وہ اپنے آپ کو ڈاکو نہیں سمجھ رہا تھا۔ دوسری طرف رام چند نے اردگرد کے علاقے میں رہنے والوں کو دعوت پر بُلایا اور ملک کے خلاف پروپیگنڈا شروع کیا کہ جو حکمران بھی آتا ہے وہ سندھیوں کو مارتا ہے۔ اس کے بعد "رام چند۔ زندہ باد" اور "سندھو دیش۔ زندہ باد" کے نعرے بھی لگے۔ دعوت کے بعد رام چند سردار قادر خان کو ایک خفیہ کمرے میں لے گیا جہاں بے شمار اسلحہ موجود تھا۔ رام چند نے قادر خان کو کہا کہ وہ ہر اُس آدمی کو اغوا کرے یا گولی مار دے جو فوج کو کسی بھی ڈاکو کے بارے میں کچھ بتائے۔ پھر اُس نے قادر خان کو کہا کہ وہ مشہور پاکستان دوست لیڈر عبدالحق کو ہر قیمت پر اغوا کرے۔ اِدھر جانو کی ماں کو جب علم ہُوا کہ اس کا بیٹا ڈاکوؤں کے گروہ میں شامل ہوچکا ہے تو وہ یہ صدمہ برداشت نہ کر سکی اور مر گئی۔ دوسری طرف ایک روز رات کے وقت عبدالحق اپنی کار میں گھر آرہے تھے۔ ان کے ساتھ ایک صحافی بھی تھا۔ جو ان کا انٹرویو کرنا چاہ رہا تھا۔ اچانک ایک سیاہ شیراڈ نے ان کی گاڑی کا راستہ روک لیا۔ ڈرائیور اور صحافی کو بے ہوش کر کے عبدالحق کو بھی بے ہوش کر کے شیراڈ میں بٹھا لیا گیا۔ اور اُسے ڈاکو قادر خان کے ٹھکانے پر لے گئے۔ ۲۵ تاریخ کو رام چند نے اخبار میں عبدالحق کے اغوا کی خبر پڑھی اور وائرلیس پر کسی کو اس کامیابی کی اطلاع دی۔ چند روز بعد قادر خان کی جیپ عبدالحق۔ جانو اور رام چند کے ایک آدمی کو لے کر کسی اجنبی مقام کی طرف جا رہی تھی۔ عبدالحق جانو کو غور سے دیکھتا رہا۔ جب ان کی جیپ اپنی منزل پر پہنچی تو عبدالحق جانو کو پہچان چکا تھا۔

(اب آپ آگے پڑھیے)

جیپ ایک بڑی سی حویلی کے دروازے کے باہر آکر رُکی تھی ۔ رام چند کا آدمی جیپ سے اُتر کر حویلی کے دروازے کی طرف گیا۔ جیپ میں اب عبدالحق، جانُو اور ڈرائیور تھے ۔ عبدالحق نے جانو کے قریب ہوتے ہوئے سرگوشی کی ...

"تم وسایا کے بیٹے ہو؟"

جانُو کے لئے عبدالحق کا یہ سوال بالکل اچانک تھا ۔ وہ عبدالحق کو حیرت سے یوں دیکھ رہا تھا جیسے وہ مریخ کی مخلوق ہو۔ پھر اُس نے ڈرائیور کی طرف دیکھا تو وہ جیپ سے باہر کی طرف جُھکا ہوا رام چند کے آدمی کو دیکھ رہا تھا۔ جانو نے جب دوبارہ عبدالحق کو دیکھا تو وہ اُسے ابھی بھی جواب طلب نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ اور پھر جانو کی زبان سے بے اختیار سرگوشی کے انداز میں "ہاں" کا لفظ نکل گیا۔

"ہاں" کا لفظ سُن کر عبدالحق کے چہرے پر حیرانی اور غم کے تاثرات صاف دیکھے جا سکتے تھے۔ لیکن جانو

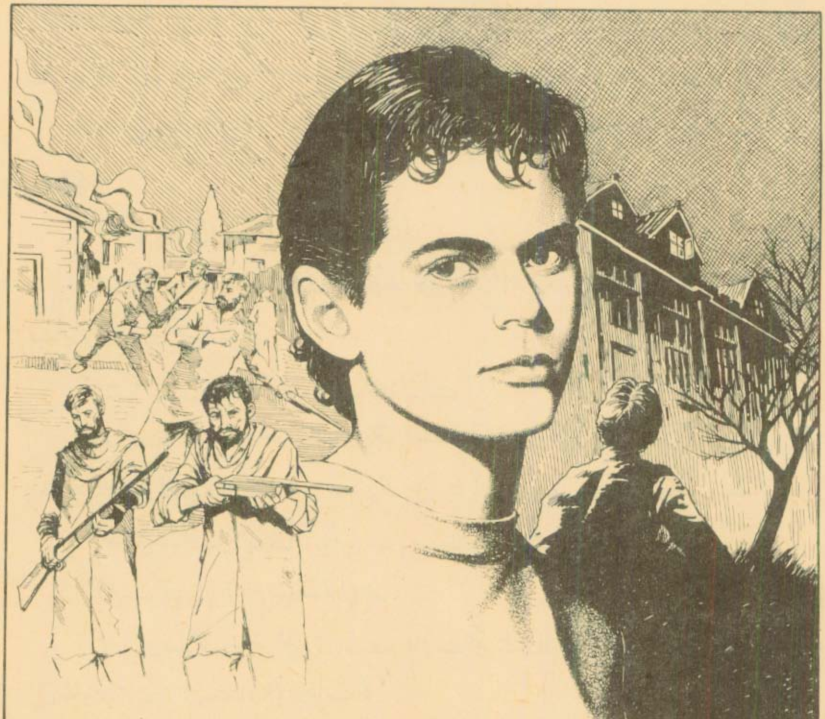

اس فکر میں تھا کہ کہیں یہ سب کچھ ڈرائیور نے سُن تو نہیں لیا۔ عبدالحق شاید کچھ اور پوچھنا چاہتا تھا۔ لیکن اتنی دیر میں حویلی کا دروازہ کھُل چکا تھا اور رام چند کا آدمی ڈرائیور کو جیپ اندر لانے کے لئے کہہ چکا تھا۔

جیپ حویلی کے صحن میں کھڑی ہو گئی۔ وہاں رام چند اور کئی دوسرے لوگ پہلے سے ہی موجود تھے ... رام چند کو دیکھ کر جانو حیران رہ گیا۔ لیکن اُسے خوشی بھی ہوئی کہ اب وہ اکیلا نہیں ہے۔ عبدالحق کو جب جیپ سے نیچے اُتارا گیا تو اُسے دیکھ کر رام چند نے حقارت سے تھوک دیا۔ اور اُسے گھورتے ہوئے کہنے لگا۔

"تم ہو عبدالحق! لے جاؤ اسے تہہ خانے میں۔" عبدالحق نے بھی بڑے غصّے سے اُس کی طرف دیکھا۔ پھر اس نے جانو کی طرف دیکھا۔ وہ جانو کو کچھ کہنے ہی والا تھا کہ اُسے دھکا دیتے ہوئے ایک آدمی نے سختی سے اپنے پیچھے آنے کو کہا۔ جانو رام چند کے ساتھ کھڑا رہا۔

وہ سوچ رہا تھا کہ عبدالحق اُسے کس طرح جانتا ہے؟ اُس نے تو کبھی اُسے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ "ہوسکتا ہے کہ وہ میرے والد کا دوست ہو۔" لیکن میرے والد تو کبھی شہر نہیں گئے۔ یہ مجھ سے کیا پوچھنا چاہتا ہے؟ رام چند اور قادرخان اس کے دشمن کیوں ہیں؟ اگر یہ ڈاکوؤں کا دشمن ہے تو میرے والد بھی تو ڈاکوؤں کے خلاف تھے۔ تو کیا واقعی یہ میرے والد کا دوست ہے؟" اس کے پاس ان سوالوں کا کوئی جواب نہ تھا۔

"کیا سوچ رہے ہو بیٹے؟" رام چند کے سوال پر جانو نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا۔ پھر اُس نے رام چند سے پوچھا۔

"ادّا! کیا عبدالحق میرے باپ کو جانتا ہے؟"

رام چند جانو کے اس سوال پر بُری طرح بدکا۔ جانو کو یوں معلوم ہُوا جیسے اُس نے سوال کے بجائے بے خبری میں اُسے تھپڑ مار دیا ہو۔

"تمہیں کس نے بتایا کہ وہ تمہارے باپ کو جانتا ہے؟" اُس نے انتہائی سخت لہجے میں پوچھا۔

جانو کے لئے رام چند کا یہ لہجہ بالکل اجنبی تھا۔ اُسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ کہ کیا یہ وہی رام چند ہے جو ابھی چند لمحے پہلے اس سے بڑی ہمدردی اور پیار سے بات کر رہا تھا۔ اُس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"عبدالحق نے مجھ سے پوچھا تھا کہ کیا تمہارے باپ کا نام وسایا ہے؟"

"تو تم نے کیا بتایا؟" رام چند نے فوراً پوچھا۔

"مم... میں نے کک... کچھ نہیں بتایا اُسے۔" جانو نے جھُوٹ بولا۔ کیونکہ اُسے لگ رہا تھا کہ اگر اُس نے سچ بتایا تو رام چند اُس سے ناراض ہو جائے گا۔

"اگر تم نے اُسے کچھ بھی بتایا ہے تو ابھی بتادو۔ ورنہ پھر مجھ سے کسی ہمدردی کی امید نہ رکھنا۔"

"نہیں ادا! اگر میں نے آپ سے کچھ چھپانا ہوتا تو بات ہی کیوں کرتا"

رام چند نے زور سے "ہوں" کی پھر کچھ دیر سوچنے کے بعد بولا۔

"تم ابھی تم ڈرائیور کے ساتھ واپس قادر خان کے پاس جاؤ گے اور اپنے بھائی بہنوں کو مل کر واپس آجاؤ گے"

جانو کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن رام چند اُسے حیران پریشان چھوڑ کر حویلی کے برآمدے کی طرف چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ واپس آیا تو اُس کے ساتھ کچھ آدمی بھی تھے۔ انہوں نے جیپ میں بڑی بڑی بندوقیں اور دو بڑے صندوق رکھے۔ جیپ کا انجن اسٹارٹ ہُوا تو رام چند نے جانو کو خدا حافظ کہنے کے لئے ہاتھ ہلایا لیکن جانو کو صاف محسوس ہو رہا تھا کہ وہ یہ سب کچھ دکھاوے کے لئے کر رہا ہے۔

رام چند کا ڈاکوؤں کا ساتھی ہونا جانو کو پہلے بھی عجیب لگا تھا۔ اب ایک شریف آدمی کو قیدی بنانا اور پھر اس کو اغوا کرنے والوں کو اسلحہ دینا اور اس بات پر پریشان ہونا کہ عبدالحق اس کے باپ کا نام جانتا ہے یہ سب کچھ جانو کی سمجھ سے باہر تھا۔

اگلے دن عبدالحق کو حویلی کے ایک خاص کمرے میں لایا گیا تھا۔ رام چند کے علاوہ یہاں چار ہٹے کٹے اور آدمی بھی موجود تھے۔ عبدالحق کو رسّیوں سے باندھ دیا گیا تھا اس کے جسم پر ایک لُنگی کے علاوہ کوئی چیز نہ تھی۔ رام چند اُس سے کہہ رہا تھا۔

"عبدالحق... باقی باتیں تو تم سے بعد میں ہوں گی۔ پہلے یہ بتاؤ تم وسایا کو کیسے جانتے ہو؟"

"وسایا کو صرف میں ہی نہیں بہت سے لوگ جانتے ہوں گے۔ اس کی تصویر اخبار میں چھپی تھی!"

"جھوٹ... بالکل جھوٹ۔ کون سے اخبار میں چھپی تھی اُس کی تصویر" رام چند کے لئے یہ اطلاع بالکل نئی تھی۔ اس لئے اُس نے بڑے زہریلے لہجے سے یہ سوال پوچھا تھا۔

"روزنامہ گلاب میں" اور مجھے یقین ہے کہ تم جیسے بدمعاش اس طرح کا اخبار کبھی نہیں پڑھتے" عبدالحق کو یہ بات بڑی مہنگی پڑی۔ کیونکہ اس کے جواب میں رام چند نے ایک زوردار تھپڑ اس کے منہ پر مارا۔ اور پھر کمرے میں موجود سارے غنڈے اس پر پل پڑے۔ وہ اُسے اُس وقت تک پیٹتے رہے جب تک وہ بے ہوش نہ ہوگیا۔

- رام چند کو عبدالحق کی بات پر یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ وسایا کبھی شہر نہیں گیا تھا۔ اور نہ اُس نے عبدالحق کو وسایا کی گوٹھ میں کبھی دیکھا تھا۔ لیکن اُسے یاد آیا کہ وسایا کی موت پر اخبار والے بھی تو آئے تھے۔ لیکن وڈیرے کے آدمیوں نے انہیں اس کے گھر نہیں جانے دیا تھا۔ یہ خیال آتے ہی وہ مطمئن ہوگیا۔

ڈاکو قادر خان آج وڈیرے رسول بخش کی فرمائش پر ایک نئی مہم پر تھا۔ جانو بھی اس مہم میں شامل تھا۔ اُن میں سے کسی ڈاکو نے بھی نقاب نہیں اوڑھا تھا۔ ان کا رُخ جانو کی گوٹھ کی طرف تھا۔ گوٹھ میں پہنچتے ہی قادر خان کے آدمیوں نے زبردست ہوائی فائرنگ کی۔ ان کی فائرنگ سن کر وڈیرے رسول بخش کے کئی مزارعے ان کے ساتھ آملے۔ پھر وہ شور مچاتے ہوئے۔ نعرے لگاتے ہوئے ان لوگوں کے گھروں کی طرف چل پڑے۔ جنہیں آباد کار کہا جاتا تھا۔ یہ آباد کار وہ لوگ تھے جو برسوں پہلے ملک کے دوسرے حصّوں سے آکر یہاں بسے تھے۔ ایک چھوٹی سی حویلی کے سامنے آکر یہ ہجوم کھڑا ہو گیا۔ قادر خان نے حویلی کے مالک کو للکارا۔ تھوڑی دیر بعد ایک آدمی باہر نکلا۔ باہر آتے ہی قادر خان نے اُسے گریبان سے پکڑا اور زور سے دھکّا دیا۔ وہ بُری طرح گر پڑا۔ قادر خان نے اس گرے ہوئے آدمی کے سینے پر بندوق رکھتے ہوئے کہا۔

"کیا وڈیرے نے تمہیں اپنی زمین بیچ کر یہاں سے دفع ہونے کے لئے نہیں کہا تھا؟ اب تمہیں اس زمین کا کچھ نہیں ملے گا۔ اگر زندگی چاہتے ہو تو اپنے لوگوں کو کہہ دو کہ یہ گوٹھ خالی کر دیں۔"

"لیکن ہم کہاں جائیں۔ کیا ہم کئی سالوں سے اس گوٹھ کے لوگوں کے ساتھ پیار و محبّت سے نہیں رہ رہے؟" اس آدمی نے بے چارگی سے کہا۔

"یہ زمین اُن لوگوں کی ہے جو یہاں پیدا ہوئے۔ تمہارا اس پر کوئی حق نہیں ہے۔ ہم اپنا حق تم سے چھین کر رہیں گے۔" ایک پُرجوش نوجوان مزارعے نے کہا۔

"یہ اس طرح نہیں مانے گا۔ اس کے گھر کو آگ لگا دو۔" ایک اور آدمی نے کہا اور وہ واقعی آگ لگانے کا انتظام کر کے آیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں مٹی کے تیل کا ٹین تھا۔ اُس نے کسی بات کا انتظار کئے بغیر دیواروں پر تیل چھڑکنا شروع کر دیا۔

جانو یہ سب کچھ دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔ جس شخص نے دیواروں پر تیل چھڑکا تھا وہ اُسے خوب پہچانتا تھا۔ یہ وہی آدمی تھا جو عبدالحق کو قادر خان سے لے کر رام چند کے پاس لے کر گیا تھا۔ اور پھر اس کے دیکھتے ہی دیکھتے گھر کو آگ لگا دی گئی۔ اس آدمی کے بیوی بچّے چیختے چلّاتے، روتے دھوتے باہر آگئے۔ گھر کا مالک انہیں لے کر چپ چاپ اس سڑک کی طرف چل پڑا جہاں سے شہر کو جانے کے لئے بسیں ملتی تھیں۔ اس کو دیکھ کر کئی دوسرے لوگوں نے بھی اپنا سامان اُٹھایا اور گوٹھ چھوڑ دینے ہی میں عافیت سمجھی۔ گوٹھ میں اب کوئی بھی آباد کار نہیں بچا تھا۔

اس ہنگامے سے فارغ ہو کر جانو کو قادر خان نے اجازت دی کہ وہ اپنے بھائی بہنوں سے مل آئے۔ اُسے یہ بھی حکم ملا کہ اگلے روز وہ منظور اور "کوبے" کے ساتھ مل کر ٹھکانے پر واپس پہنچ جائے۔

ماں کے مرنے کے بعد جانو پہلی مرتبہ بھائی بہنوں سے ملنے جا رہا تھا۔ وہ رام چند کے گھر بھی پہلی دفعہ جا رہا تھا۔ اس کے پچھلے رویّے کے بعد اس کا گھر جانے کو دل تو نہیں چاہ رہا تھا۔ لیکن بہن بھائیوں کی محبت کی کشش اُسے کھینچ رہی تھی۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ ماں باپ کے مرنے کے بعد وہ ان کا واحد سہارا ہے۔ سخت بے چینی اور ضمیر کی چبھن لیئے وہ رام چند کے گھر کے اندر داخل ہوا۔ اُسے کسی کے رونے کی آواز آئی۔ وہ آواز کی سمت چلا گیا۔ برآمدے سے گزرنے کے بعد وہ ایک بڑے کمرے کے دروازے پر پہنچ گیا تھا۔ کمرے میں جو کچھ ہو رہا تھا۔ اُسے دیکھ کر اُس کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ ایک عورت اُس کی سب سے چھوٹی بہن، جس کی عمر بمشکل چار سال ہوگی، کو بُری طرح مار رہی تھی۔ جانو کے دیکھتے دیکھتے اُس نے اُس کے پھُول سے چہرے پر دو تھپڑ مارے پھر کمر پر زور سے لات ماری۔ وہ زمین پر اس طرح گری جیسے قبر پر پھُول پھینکا گیا ہو۔ گری ہوئی بچّی کو اُس نے بالوں سے پکڑا، لیکن ابھی وہ اسے بالوں سے پکڑ کر اُٹھانا ہی چاہتی تھی کہ جانو کا مضبوط ہاتھ عورت کی کلائی پر پڑا۔ عورت نے چونک کر جانو کی طرف دیکھا اور ڈر کر ایک طرف ہٹ گئی۔

"کک... کون ہو تم..." وہ زخمی بلّی کی طرح غرّائی۔

جانو نے اُس کی طرف کوئی توجہ نہیں کی۔ اُس نے ننھی حمیدہ کو اُٹھایا اور سینے سے چمٹا لیا۔ ننھی حمیدہ اس کے سینے سے چمٹ کر پھُوٹ پھُوٹ کر رو رہی تھی۔ یہ وہی حمیدہ تھی جسے اُس کے ماں باپ نے غریب ہوتے ہوئے بھی کبھی نہیں رُلایا تھا۔ جو ہر وقت ہرنی کی طرح خوش خوش چوکڑیاں بھرتی رہتی تھی۔

وہ عورت جو رام چند کی بیوی تھی۔ سمجھ چکی تھی کہ آنے والا بچی کا بھائی ہے۔ وہ کچھ خاموش رہی پھر اُس نے کڑک کر کہا "تم کس کی اجازت سے اندر گھسے ہو۔ چلو باہر نکلو... میری طرف اس طرح گھُور کر کیوں دیکھ رہو۔ آنکھیں نکال دوں گی تمہاری۔ اتنی لاڈلی تھی تو یہاں چھوڑ کر کیوں گئے تھے... ! ابے چھوکرے! میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو۔ چلو باہر صحن میں جا کر کھڑے ہو۔"

جانو کو رام چند کا خیال نہ ہوتا تو وہ ضرور اس عورت کی پٹائی کر دیتا لیکن غصّے کو بے بسی کے ساتھ پی جانا تو اُس نے بہت پہلے کا سیکھ رکھا تھا۔ وہ ننھی حمیدہ کو گود میں اُٹھائے چپکے سے باہر کی طرف چل پڑا۔

"چُپ ہو جا میری گڑیا۔ چُپ ہو جا" جانو اپنے آنسوؤں کو بمشکل روکتے ہوئے اپنی بہن کے آنسو پونچھنے لگا۔

"بھیا... آپ..."

جانو نے چونک کر دیکھا۔ اُس کی دوسری بہن، جو اُس سے چھوٹی تھی۔ اُس کے کپڑے بہت میلے ہو رہے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ وہ ماں کے مرنے کے بعد سے ابھی تک نہیں نہائی۔ اُس کے ہاتھ اور کپڑے گیلے تھے شاید برتن مانجھتے یا کپڑے دھوتی آئی تھی... وہ پہلے سے بہت کمزور ہو چکی تھی۔ جانو اس کی یہ حالت دیکھ کر بڑی

مشکل سے اپنے آنسو روک سکا۔ اُس نے کمزور سی آواز میں ننھی حمیدہ سے بڑے دس سالہ بھائی کے متعلق پوچھا۔
"رمضان کا کیا حال ہے؟ وہ کہاں ہیں؟"
"اس کا حال بھی ہماری طرح بہت اچھا ہے۔ سارا دن بھینسوں کی خدمت کرتا ہے۔ خوب تھک جاتا ہے تو گہری نیند سو جاتا ہے... کبھی کبھار اس کی صورت دیکھ لیتی ہوں۔"
"نہیں بھیا...! جب وہ مالکن سے روٹی مانگتا ہے نا تو وہ اُسے ڈنڈے مار کر بھگا دیتی ہے۔ پھر باجی چوری چھپے اپنی روٹی اُسے دے دیتی ہے۔"
جانو نے اپنی بہن کی طرف دیکھا۔ بہن نے بھی جب بھائی کی طرف دیکھا تو اُس کی آنکھوں میں آنسوؤں اور سسکیوں کا رُکا ہوا سیلاب بہہ نکلا۔ اس نے اپنا منہ چھپا لیا۔ اُسے منہ چھپا کر چپکے چپکے رونے کی بہت مشق ہو گئی تھی۔ اس لیے رونے کی آواز جانو تک بھی نہیں پہنچ سکی تھی۔ جانو نے ننھی حمیدہ کو سینے سے چمٹاتے ہوئے کہا۔
"چلو بہن! میرے ساتھ چلو۔ میں تمہیں اپنے ساتھ رکھوں گا۔"
"نہیں... ماں نے مرتے وقت مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ جب تک تم قادر خان کے ساتھ رہو گے میں تم سے نہ کچھ لوں گی اور نہ تمہارے ساتھ رہوں گی... میں ماں سے اپنا وعدہ نہیں توڑ سکتی بھیا۔ تم بس ہمیں مل جایا کرو۔"
"نہیں رشیدہ... نہیں... میں قادر خان کے ساتھ نہیں رہوں گا۔ میں ڈاکو نہیں بنوں گا۔ تم آج رات میرا انتظار کرنا۔ میں چاند چڑھے اسی جگہ آؤں گا۔ تم حمیدہ اور رمضان کے ساتھ میرا انتظار کرنا۔ تمہیں ماں کی قسم، میرا انتظار کرنا۔"
یہ کہہ کر اُس نے حمیدہ کو نیچے اُتارا اور تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا باہر نکل گیا۔

چاند ابھی نہیں نکلا تھا۔ رات اتنی اندھیری تھی کہ جانو کو اس اندھیرے میں اور اپنی قسمت میں کوئی فرق نظر نہیں آ رہا تھا۔ لیکن اس کے اندر جو آگ لگی ہوئی تھی۔ وہ آج پوری طرح بھڑک رہی تھی۔ شاید اسی آگ کی روشنی میں وہ راستہ دیکھتا اس حویلی میں پہنچ چکا تھا۔ جہاں عبدالحق کو رکھا گیا تھا۔ اُسے حویلی کی دیوار پھلانگنے میں کوئی زیادہ دقت نہیں ہوئی تھی۔ حویلی کا اُسے صرف ایک کمرہ ایسا نظر آیا جہاں اُسے ہلکی ہلکی روشنی نظر آ رہی تھی۔ وہ بلی کی طرح دبے پاؤں اس کمرے کی طرف بڑھا۔ اُس کے ہاتھ میں صرف ایک ڈنڈا تھا، جو اُس نے مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ جب وہ برآمدے میں داخل ہونے لگا تو اُس کا پاؤں بُری طرح کسی سے ٹکرایا۔ ڈنڈا نہ ہوتا تو شاید منہ کے بل گرتا۔ ڈنڈا کسی پکے فرش پر لگا تھا۔ آواز بھی اسی لئے کافی پیدا ہوئی اور کسی نے اُسے للکارا۔
"کون ہے! ٹھہر جاؤ ورنہ گولی مار دوں گا۔"

آگے کیا ہوا؟ یہ آپ آئندہ شمارے میں پڑھئے

زمین کی قوتیں

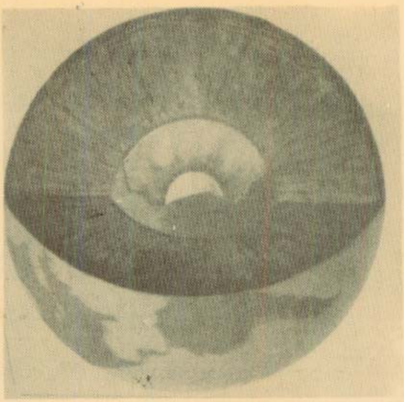

ایک دنیا زمین کے اوپر آباد اور ایک دنیا زمین کے اندر چھپی ہے

اسی دنیا کے بارے میں حیرت انگیز معلومات

شبینہ فاروقی

زمین سے انسان کا رشتہ بہت پُرانا ہے ۔ زمین انسان کو اس کی بنیادی ضروریات کی فراہمی کا ذریعہ ہے ۔ شاید اسی لئے اسے ماں بھی کہا جاتا ہے ۔ زمین اپنی اسی اہمیت کی بنیاد پر ہمیشہ سے انسان کے گہرے مطالعے کا مرکز رہی ہے ۔ جدید دور میں ہونے والی بعض تحقیقات سے زمین کے بارے میں بہت سے دلچسپ حقائق سامنے آئے ہیں ۔ مثال کے طور پر یہ کہ زمین کے اندر اتنی زبردست مقناطیسیت پائی جاتی ہے کہ یہ قطب نما کی سوئی کو حرکت میں لاسکتی ہے ۔ اس طرح یہ بھی ثابت ہوا ہے کہ قطب شمالی کی سمت ہر ماہ تھوڑی سی تبدیل ہو جاتی ہے ۔ قطب شمالی کی سمت میں تبدیلی کا تھوڑا سا تعلق سورج ، چاند اور دوسرے قریبی ستاروں کی سمت میں تبدیلی سے بھی ہے ۔ خیال ہے کہ سورج کے اندر پائے جانے والے دھبے یعنی SUN SPOTS بھی زمین کے مقناطیسی میدان پر اثر انداز ہوتے ہیں ۔

بڑے جانوروں کی نسبت چھوٹے جانور زمین کی مقناطیسیت کو زیادہ شدّت کے ساتھ محسوس کرتے ہیں ۔ مثال کے طور پر گھونگھے کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ سورج کی سمت میں حرکت کرتا ہے ۔ تاہم اگر اس کے قریب ایک مقناطیس رکھ دیا جائے تو یہ سورج کی سمت میں حرکت کرنا بند کر دیتا ہے ۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ گھونگھا زمین کے مقناطیسی میدان پر سورج کے پڑنے والے اثرات کے تحت حرکت کرتا ہے ۔

بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ دنیا کے ایک حصّے سے دوسرے حصّے میں ہجرت کرنے والے پرندے شمال اور جنوب کی سمتوں کا تعیّن زمین کی مقناطیسی صلاحیت کے ذریعے سے ہی کرتے ہیں۔ شاید اُن کے اندر بھی قطب نما جیسی کوئی چیز پائی جاتی ہو؟

پودوں پر ہونے والی تحقیقات سے ثابت ہوا ہے کہ یہ بھی زمین کی مقناطیسی قوّت سے متاثر ہو سکتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ شمالاً جنوباً بویا جانے والا کوئی بھی بیج زیادہ تیزی کے ساتھ نمو پاکر پھلتا پھولتا ہے۔ اگر پودوں کی جڑوں کے آس پاس مقناطیس رکھ دیئے جائیں تو وہ عام حالت سے کہیں زیادہ تیزی کے ساتھ نشوونما پاتے ہیں۔

برق یا بجلی :- بجلی جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں اُن چیزوں میں سے ہے جسے انسان نے پیدا کیا ہے۔ یہ بھی ہم سب ہی جانتے ہیں کہ بجلی انسان کو ہلاک کر سکتی ہے۔ تاہم اس بجلی کے برعکس فضا میں ایک فطری برق یا بجلی بھی پائی جاتی ہے۔ فضا میں پائی جانے والی یہ بجلی اتنی کمزور ہوتی ہے کہ لوگوں کو اس کی موجودگی کا احساس نہیں ہوتا۔ تاہم خیال ہے کہ یہ بجلی ہمارے محسوس کرنے کے عمل پر اثرانداز ہوتی ہے۔ یہ فطری بجلی زمین کے خارجی اور داخلی ماحول یا فضائی تبدیلی سے پیدا ہوتی ہے۔ اس طرح کی بجلی پیدا کرنے کا آسان ترین طریقہ یہ ہے کہ کچھ اشیاء کو رگڑا جائے۔ (جیسے ہم فرنیچر صاف کرتے ہیں) اس طرح کی رگڑ ــــ ساکن بجلی پیدا کرتی ہے۔

(گویا یہ بجلی عام بجلی کی طرح متحرک نہیں ہوتی) اس کی پیدائش کا احساس اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ فضا میں موجود چھوٹے چھوٹے ذرّات رگڑی جانے والی شے کی طرف کھنچنے لگتے ہیں۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ پانی ہائیڈروجن اور آکسیجن کا ایک ڈھیلا سا مرکب ہوتا ہے۔ جب پانی قطروں میں

تقسیم ہوتا ہے تو ہائیڈروجن اور آکسیجن کے عام ایٹم سے بھی چھوٹے ایٹم ایک دوسرے سے علیحدہ ہو جاتے ہیں۔ ان ایٹموں کو IONS یا برق پارے کہتے ہیں۔ یہ برق پارے ایک دوسرے سے علیحدہ ہو کر ہَوا میں داخل ہو جاتے ہیں۔ یہ برق پارے منفی یا مثبت چارج کے حامل ہوتے ہیں۔

جب پانی قطروں میں تقسیم ہو جاتا ہے تو ہَوا میں موجود بیشتر برق پارے منفی ہوتے ہیں۔ خیال ہے کہ ہَوا میں بہت سے منفی برق پاروں کی موجودگی انسانوں کو زیادہ خوشگوار مزاج زیادہ توانا اور زیادہ بیدار بنا دیتی ہے۔ اس طرح پانی کی قطروں میں تقسیم انسانوں پر اثرات مرتب کرتی ہے۔ اس صورتِ حال کی بہت سی عام مثالیں موجود ہیں۔ مثال کے طور پر جب ہم شاور یا آبشار کے نیچے کھڑے ہو کر نہاتے ہیں یا ساحلِ سمندر پر چہل قدمی کرتے ہیں تو ہم اپنے آپ کو تازہ دم محسوس کرتے ہیں۔ اسی طرح خشک موسم کے بعد ہونے والی بارش ہمیں پہلے سے زیادہ خوشگوار مزاج بنا دیتی ہے۔

گزشتہ برسوں میں کچھ لوگوں نے ہوا کے انسانوں پر مرتب ہونے والے اثرات پر تحقیقات کی ہیں۔ کچھ لوگوں کا بیان ہے کہ تیز ہَوا چل رہی ہو تو وہ نروس ہو جاتے ہیں۔ اور اُن کے مزاج میں تلخی آجاتی ہے اور وہ بہت جلد غصے میں آجاتے ہیں۔ تیز ہوا کے اثرات کے تحت، بہت سے لوگ خود کو بیمار بیمار سا محسوس کرنے لگتے ہیں۔ اور بہت سے لوگ تو ایسے بھی ہیں کہ اگر تیز ہوا چل رہی ہو تو وہ پوری رات جاگ کر گزار دیتے ہیں۔

دُنیا کے اُن خطوں میں جہاں تیز گرم ہوائیں چلتی ہیں۔ دیکھا گیا ہے کہ ٹریفک کے حادثات کی تعداد دوسرے خطوں کے مقابلے پر زیادہ ہوتی ہے۔ بہت سے لوگ تیز ہواؤں سے پریشان ہو جاتے ہیں اور اُن کی یہ پریشانی حادثے کا سبب بن جاتی ہے۔

تیز اور گرم ہواؤں کے چلنے کے دوران اِن خطوں میں جراثیم کی تعداد میں اضافہ ہو جاتا ہے اور بعض لوگ اس قدر مشتعل ہو جاتے ہیں کہ وہ خود کو ہلاک کر لیتے ہیں۔ یہ تمام اثرات ہوا میں مثبت برق پاروں یعنی IONS کی موجودگی کے باعث ہوتے ہیں۔ خیال ہے کہ گرم اور تیز ہَوا والے موسم میں ہوا کے اندر مثبت برق پاروں کی مقدار بہت بڑھ جاتی ہے۔

انسانوں کے رویوں پر فطری بجلی کے اثرات کو وہ لوگ زیادہ بہتر انداز میں سمجھ سکتے ہیں۔ جنہیں معلوم ہے کہ انسان کے ذہن کی لہریں برقی ہیں۔ ان برقی لہروں کی رفتار اور سائز ہی دراصل اس بات کا تعین کرتا ہے کہ کوئی شخص سو رہا ہے، خواب دیکھ رہا ہے، خالی ذہن ہے یا کسی پیچیدہ مسئلے کے بارے میں غور و فکر کر رہا ہے۔ یہ فطری برق پیڑ پودوں پر بھی مثبت یا منفی اثر ڈالتی ہے۔ روس میں ہونے والی تحقیق سے ظاہر ہوا ہے

کہ پودوں سے گزرنے والی برقی رواُن کی جلد کی بہتر نشوونما کی ضامن ہوتی ہے۔ تحقیق سے یہ بھی ظاہر ہُوا کہ ان علاقوں میں پیڑ پودے زیادہ تیزی سے بڑھتے ہیں۔ اور زیادہ قدوقامت نکالتے ہیں۔ جہاں یہ برقی رو زیادہ پائی جاتی ہے۔ اس کی ایک عُمدہ مثال کینیا کا مُون نام کا پہاڑی سلسلہ ہے جہاں تمام پیڑ پودے نہ صرف یہ کہ حیرت انگیز طور پر بڑھتے ہیں بلکہ وہ زیادہ پھول اور پھل بھی دیتے ہیں اگرچہ یہ خطہ انتہائی سرد ہے اور یہاں کی مٹی بھی زیادہ زرخیز نہیں ہے۔ وہی پودے جو یہاں بہت تیزی سے بڑھتے ہیں۔ کسی دوسری جگہ پر بہت ہی سُست رفتاری سے بڑھیں گے۔ اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ کینیا کے اس علاقے میں فطری بجلی کی خاصی مقدار پائی جاتی ہے۔

فضا میں برقی رَو بادل پیدا کرنے کے علاوہ برقی طوفان بھی پیدا کر سکتی ہے۔ ہم یہ بات آپ کو پہلے ہی بتا چکے ہیں کہ سورج کے دھبتوں SUN SPOTS اور موسم کے درمیان گہرا تعلق ہے۔ خیال ہے کہ سورج کے دھبتوں میں ردّوبدل سے فضا میں موجود برقی رو میں بھی تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں۔ اسی لئے کچھ علاقوں میں طوفانِ بادوباراں آتا ہے۔

آپ نے دیکھا ہماری زمین کیسی حیرت انگیز سرگرمیوں کا مرکز ہے۔ یہ اور بات کہ ہم اپنی کم علمی کے باعث اس کا شعور نہیں رکھتے لیکن اگر ہم اُن کا شعور رکھیں تو پھر یہ ممکن ہے کہ ہم اُن پر قابو پا کر انسانوں کے لئے کوئی مفید کام کر سکیں۔ مگر یہ کام اُسی وقت ممکن ہے جب ہم علم سے محبّت کریں۔

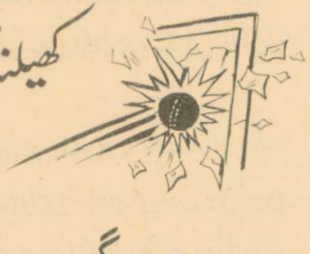

کھیلنا آپ کا حق ہے ...

... مگر ...

کوئی کھیل اس طرح نہ کھیلئے

جس سے کسی بھی طرح کے نقصان کا اندیشہ ہو

گلی محلّوں کے بجائے کھیل کے لئے میدان کا رُخ کیجیے۔

(اشتہار ادارہ)

Vasa
shoes
SUPER TURBO
SWIFT RUNNER
BI-COLOUR JOGGER
Better grip ■ Dependable and Durable
Available at all shoe stores
Young generation stands in Vasa

پاپوش نگر

ابنِ شہباز خان

باتَ کا بتنگڑ بنانا تو کوئی رُونی بھائی سے سیکھے۔ بات سے بات نکالنا اُن کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ آج شاید انہیں محاوروں کا بخار چڑھا ہُوا تھا۔ اس لئے آتے ہی محاوروں کی برسات شروع کر دی۔

شوق ہو تو ایسا کار کو بھی جُوتا بنا ڈلا

جُوتا اور اُس کے ساتھ جُوتے کے تمام اجزاءُ

جُوتے کے پیندے میں سوراخ پاؤں کے آرام کا باعث

"میاں! زمانہ بڑا خراب ہے۔ اسے ہماری بدقسمتی کہو کہ ہم کلیم صاحب کے یہاں ولیمے میں چلے گئے۔ بیٹھنے کے لئے جوتیاں توڑنا پڑیں تب کہیں جا کر جگہ ملی۔ ہجوم اتنا تھا کہ صرف بیٹھنے کے واسطے جُوتے چل گئے۔ ایک دوسرے پر وہ جُوتے برسائے گئے کہ الامان! ہم نے پیچ بچاؤ

کرانا چاہا، مگر اُن کم بختوں نے تو ہمیں جُوتی کے برابر بھی نہ سمجھا۔ یہ جوتا جاتی دیکھ کر بالآخر اپنے خاں صاحب جلال میں آ گئے۔ دہاڑتے ہوئے اُٹھے اور جُوتم جوتا میں مصروف لڑکوں کی اپنے جُوتے سے وہ خبر لی کہ وہ سب جُوتیاں بغل میں دابنے پر مجبور ہو گئے۔ حالانکہ ہم نے اُنھیں کتنا سمجھایا تھا، مگر وہ تو جوتیوں سمیت آنکھوں میں گھسے آ رہے تھے، مگر اس ہٹ دھرمی کا کیا فائدہ ہُوا؟ اُلٹا خاں صاحب کے جُوتے کھائے اور جگہ بھی جُوتیوں میں بیٹھنے کو ملی!"

رُونی بھائی نے تو یہ کہہ کر اپنا "جُوتا نامہ" ختم کر دیا، مگر ہم پر اس کا اتنا گہرا اثر ہُوا کہ ہم نکل کھڑے ہوئے، جُوتے پر تحقیق اور معلومات کرنے۔ بڑے دنوں تک جوتیاں چٹخاتے پھرے۔ ہمارے یہاں تو جوتیوں میں دال بٹنے والا حساب ہے۔ کسی نے کچھ بتایا ہی نہیں، مگر ہم نے بھی ہمت نہ ہاری اور برابر کوشش میں لگے رہے۔ یہاں تک کہ جُوتے گھس گئے، تب کہیں جا کر قدرے کامیابی ہوئی۔ جُوتوں پر اُردو کے محاورے تو آپ نے پڑھ ہی لیے، اب اس کے متعلق ہماری تحقیقی معلومات ملاحظہ فرمائیے:-

جُوتے پہننے کا آغاز کب ہُوا؟ تاریخ بتاتی ہے کہ ۱۶۰۰ ق م قبلِ مسیح میں بابل اور شام کی قدیم تہذیبوں میں جُوتے پہننے کا رواج تھا۔ گویا جُوتے پہننے کا آغاز ۱۶۰۰ ق م قبلِ مسیح سے ہُوا۔ یُونان میں بھی خواتین گھر سے باہر جاتے وقت سینڈل پہن کر جاتی تھیں اور گھر میں اُوپر تک بند جوتے پہنتی تھیں۔ پھر یونانی تہذیب جیسے جیسے ترقی کرتی گئی، جوتے کی بناوٹ اور ڈیزائن میں بھی تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ صحیح معنوں میں جُوتے نے یُونانی تہذیب کے عروج کے زمانے میں ترقی کی۔ اس دور میں جُوتے کی شکل و صورت میں مزید خوبصورتی پیدا ہوئی۔ اور یہ زیادہ دیدہ زیب اور آرام دہ ہوتا گیا۔ جُوتوں کا دوسرا دور رومن شہنشاہوں کے زمانے سے شروع ہوتا ہے۔ رومن شہنشاہوں کے دور میں جوتوں کو مزید ترقی دی گئی۔ اس زمانے میں مختلف طبقوں کے جُوتے مختلف ہوتے تھے۔ یعنی کسی شخص کے جوتوں کو دیکھ کر ہی پتا چل جاتا تھا کہ وہ کس طبقے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس دور میں خواتین عموماً سفید، لال، ہرے اور پیلے رنگ کے جُوتے پہنتی تھیں۔ جبکہ مجلسِ قانون ساز کے لوگ کالے چمڑے کے جُوتے استعمال کرتے تھے اور اعلیٰ حکام اور امرا کے سفید جُوتے ہوتے تھے۔ اس طرح مختلف ادوار میں جُوتوں کی شکل اور ہیئت میں تبدیلی اور ترقی ہوتی رہی اور جُوتے نئی نئی شکلیں اختیار کرتے آگے بڑھتے رہے۔

پہلی شُو فیکٹری ۱۷۶۰ء میں میساچوسٹس میں قائم ہوئی۔ اس فیکٹری کے قیام کے بعد بڑے پیمانے پر جُوتوں کی پیداوار شروع ہوئی۔ تاہم جُوتوں کی ہمہ گیر ترقی ۱۹ ویں صدی میں ہوئی۔ جب ان کو بنانے اور سینے کے لیے مشینیں ایجاد ہو گئیں۔ جبکہ اس سے قبل جُوتے ہاتھوں سے بنائے جاتے تھے۔ اب ترقی یافتہ ممالک میں جُوتے تکنیکی مہارت کے ساتھ تیار ہوتے ہیں۔ پہلے کاغذ پر جُوتے کی ڈرائنگ تیار کی جاتی ہے۔ پھر اُسے کمپیوٹر میں فیڈ کیا جاتا ہے اور کمپیوٹر اُن کی حتمی شکل اپنی اسکرین پر پیش کر دیتا ہے۔ گویا اب جُوتے بھی

کمپیوٹر کی مدد سے بننے لگے ہیں !

کیا آپ جانتے ہیں کہ جب آپ دوڑتے ہیں تو ہر قدم کے ساتھ آپ کے پاؤں کی ۲۶ ہڈیاں، ۲۰ پٹھے اور ۱۰۰ سے زائد عضلات حرکت کرتے ہیں۔ اگر پاؤں میں اچھے اور آرام دہ جوتے موجود ہوں تو تکلیف بھی نہیں ہوتی اور پیروں کو آرام بھی ملتا رہتا ہے۔ کیونکہ اچھے اور آرام دہ جوتے پاؤں کے لیے گھر کی مانند ہوتے ہیں۔ اسی لیے جوتا ساز کمپنیاں اس بات کی کوشش کرتی ہیں کہ پیروں کو اُن کے "گھروں" میں زیادہ سے زیادہ آرام ملے ! خاص طور پر وہ ادارے جو اسپورٹس شوز تیار کرتے ہیں، اس طرف خاص توجہ دیتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ جوتوں کا نرم تلا جہاں آپ کے چلنے اور بھاگنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے، وہیں یہ آپ کی توانائی کو زیادہ خرچ ہونے سے بھی بچاتا ہے۔

آپ بازار جاتے ہیں اور اپنی پسند کا کوئی جوتا خرید لاتے ہیں اور اسے استعمال کر کے پُرانا بھی کر دیتے ہیں۔ مگر کیا آپ نے کبھی اس بات پر غور کیا ہے کہ جوتے بنتے کس طرح ہیں ؟ آئیے، ہم آپ کو جوتا بننے کی تفصیل بتائیں۔ جوتا بننے کا عمل کئی مرحلوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ ڈیزائننگ، چمڑے کی کٹنگ، سول، فیتے اور سلائی اور ٹکائی وغیرہ۔ تب کہیں جا کر چمڑے کا ایک جوتا یا جاگنگ شوز وغیرہ تیار ہوتے ہیں اور آپ انھیں پہن کر کھیل کے میدان میں کارنامے انجام دیتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ کھیل میں کارکردگی کا جوتوں کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔

جوتوں کے مختلف جوڑوں کو جدید ترین مشینوں پر سیا جاتا ہے۔ مختلف سائزوں کے اعتبار سے جوتوں کو سانچوں میں پہنا کر انھیں حتمی شکل میں لایا جاتا ہے۔ جوتے کا تلا مشین کے ذریعے چپکایا جاتا ہے۔ کھیل کے جوتے کے تلے میں ایک خاص کیمیائی مادہ پولی ریتھین موجود ہوتا ہے۔ اسپورٹس شوز کی خاص بات یہ ہوتی ہے کہ اس کا تلا چمڑے کے جوتے کے مقابلے میں انتہائی نرم ہوتا ہے۔ تاکہ کھلاڑی کو بھاگنے دوڑنے یا چلنے پھرنے

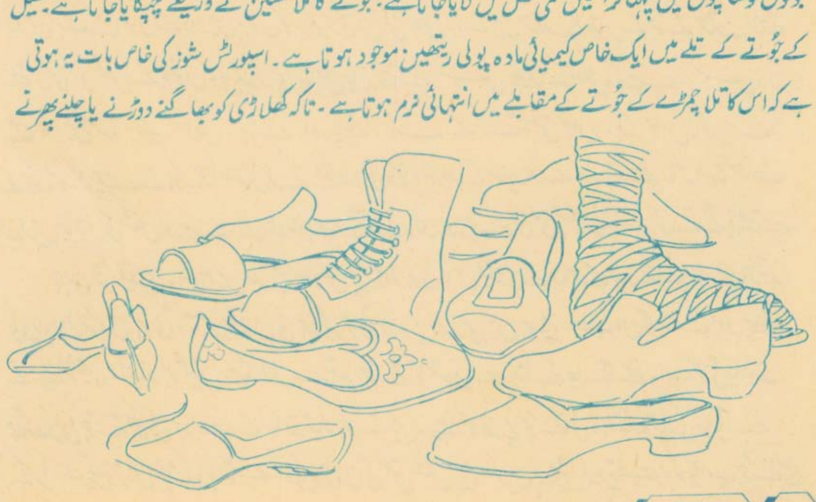

میں کسی قسم کی تکلیف یا بھاری پن محسوس نہ ہو۔

ویسے تو پاکستان میں بھی جُوتے مشینوں پر تیار ہوتے ہیں، مگر اب بھی بہت سے علاقے ایسے ہیں جہاں ہُنرمند کاریگر ہاتھوں سے جُوتے بناتے ہیں، اور وہ اتنے خوبصورت ہوتے ہیں کہ اُن کی کاریگری اور صناعی پر... بے اختیار دِل سے واہ وا نکل جاتی ہے۔ آپ نے بھی ہاتھوں کے بنے ہوئے یہ جُوتے ضرور دیکھے یا استعمال کیے ہوں گے۔ ہاتھوں کے یہ جُوتے مشین پر تیار کیے گیے جوتوں سے زیادہ دیرپا اور مضبوط ثابت ہوتے ہیں۔ گویا انسان کو مشینوں پر اب بھی فوقیت اور برتری حاصل ہے۔ اور مشین اس کی ہُنرمندی کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

اب تو آپ نئے نئے ڈیزائن اور فیشن کے جُوتے بڑے شوق سے پہنتے ہیں، مگر بچپن کا وہ زمانہ بھی آپ کو یاد ہوگا، جب امی آپ سے کہتیں کہ ننگے پاؤں باہر نہ جاؤ، جُوتے پہن کر جاؤ۔ مگر آپ کی کوشش ہوتی تھی کہ جُوتے نہ پہنیں اور ننگے پاؤں ہی گھومیں پھریں۔ پھر وقت گزرنے کے ساتھ بغیر جُوتوں کے گھُومنے کی عادت ختم ہوگئی۔ پھر جب آپ اتنے بڑے ہوگئے، جتنے کہ اب ہیں تو جُوتے آپ کے پیروں میں زیادہ سے زیادہ رہنے لگے۔ آپ رات کو بستر میں جانے سے پہلے تک اپنے پاؤں جُوتوں میں ہر وقت کسے رکھتے ہیں۔ آپ شاید اس بات سے بے خبر ہیں کہ پاؤں کا جُوتوں کے اندر ہر وقت جکڑے رہنا آپ کی صحت کے لیے مُضر ہے۔ تہذیب نے جہاں انسان کو بہت سی نعمتوں سے مالا مال کیا ہے، وہاں بعض ایسی باتیں بھی رواج پاگئی ہیں، جو تندرستی کے لیے مضر اور غیر مفید ہیں۔ لیکن ہم ان کی طرف سے اس لیے آنکھیں بند کیے رہتے ہیں کہ تہذیب کے تقاضے ہمیں اس طرف متوجہ نہیں ہونے دیتے۔ تہذیب اور شائستگی کا مظاہرہ کرنا اچھی بات ہے، مگر اس میں صحت کا پہلو بھی مدِنظر رکھنا چاہیے۔

جُوتوں کا ہر وقت پہنے رہنا ایک نقصان دہ عادت ہے۔ زیادہ تر وقت جُوتے میں بند رہنے سے پاؤں کی ساخت، اس کے رگ پٹھوں اور خون کی روانی کے ساتھ ساتھ دماغی قوتوں پر بھی بہت بُرا اثر پڑتا ہے۔ پاؤں کی رگوں کا دماغ کی رگوں کے ساتھ براہِ راست اور نہایت گہرا تعلق ہے۔ جب آپ کے پیروں کی رگیں سخت جُوتوں کے لگاتار اور مناسب دباؤ کی وجہ سے متاثر ہوتی ہیں تو اس کا ناخوشگوار اثر لازمی طور پر دماغ پر بھی پڑتا ہے۔ اس لیے جہاں تک ممکن ہو، دن بھر کے کام کاج سے فارغ ہو کر جب آپ گھر واپس آئیں تو اپنے پیروں کو جُوتوں کی قید سے آزاد کر دیں۔ اور جب تک گھر میں رہیں، ہوائی چپل میں رہیں۔ کچھ ہی دنوں میں آپ محسوس کریں گے کہ اس طریقہ کار نے آپ کی صحت پر اچھا اثر ڈالا ہے۔ طبی طور پر یہ حقیقت ثابت ہوچکی ہے کہ گھاس پر ننگے پاؤں چلنے پھرنے سے عام جسمانی صحت پر بہت خوشگوار اثر پڑتا ہے۔

جُوتا خریدتے وقت اس بات کا خاص خیال رکھنا چاہیے کہ جُوتا تنگ یا سخت نہ ہو، بلکہ آرام دہ اور پیر میں قدرے ڈھیلا ہو۔ تنگ جُوتے پہننے سے دماغ اور بینائی پر بے حد بُرا اثر پڑتا ہے۔ آپ اس حقیقت کا اندازہ

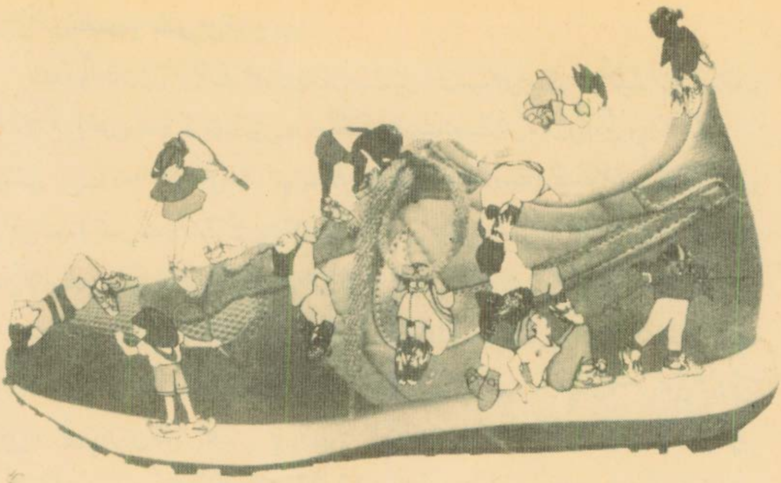

اس طرح کر سکتے ہیں کہ جس دن آپ تنگ جُوتے استعمال کریں گے، اُس دن صبح سو کر اُٹھنے کے بعد آپ کی آنکھوں میں مَیل بھرا ہوگا۔ دراصل جُوتوں کے دباؤ سے آنکھیں متاثر ہوتی ہیں، جس کا اظہار اس مَیل سے ہو جاتا ہے۔
اس لیے محض فیشن کی دوڑ میں حصّہ لینے کی خاطر تنگ یا تکلیف دہ جُوتا خریدنے کے بجائے ایسا جُوتا خریدیے، جس میں آپ کے پیر آرام اور سکون محسوس کریں۔ دانا کہہ گئے ہیں! "جان ہے تو جہان ہے"!

کھٹے میٹھے

ماہِ رواں کے منتخب لطائف

انعامی لطیفہ

دو گپّی آپس میں باتیں کر رہے تھے۔
پہلا: "میں نے ایک سو من کی مچھلی پکڑی ہے۔"
دوسرا: "میں نے جب دریا میں ڈور ڈالی تو ایک جلتی ہوئی لالٹین نکلی۔"
پہلا: "یہ ناممکن ہے!"
دوسرا: "ٹھیک! تم مچھلی کا وزن کم کرو، میں لالٹین بجھا دیتا ہوں۔"

ملک فضل ربی راجھی اعوان - میوہ شاہ کراچی

خاتون: "میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ مجھے ڈکشنری کی کوئی ضرورت نہیں۔ میرے پاس پہلے ہی سے ایک ڈکشنری موجود ہے۔"
سیلزمین: "لیکن مجھے آپ کی شیلف میں کوئی ڈکشنری نظر نہیں آئی۔"
خاتون: "وہ ادھر ٹیبل پر رکھی ہے۔"
سیلزمین: "جی نہیں، آپ مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتیں، وہ تو بائیبل ہے۔"
خاتون: "تم درست کہہ رہے ہو لیکن اتنی دُور سے تم نے بائیبل کو کیسے پہچانا؟"
سیلزمین: "اس پر جمی ہوئی گرد سے۔"

سید سلطان احمد، کراچی

ایک صاحب اپنے زمیندار دوست کے ہاں جا کر مہمان ٹھہرے۔ ایک دن زمیندار دوست نے اُن سے کہا: "مجھے شہر میں کام ہے اگر تم چاہو تو رائفل اور دو کُتّے لے کر جنگل میں چلے جاؤ اور اپنا نشانہ آزماؤ۔"

وہ صاحب رائفل اور دو پالتو کتّے لے کر جنگل میں چلے گئے۔ لیکن تھوڑی دیر بعد ہی واپس آ گئے۔

"کوئی اور چیز چاہیے؟" زمیندار دوست نے پوچھا۔ "ہاں۔ اور کتّے ہوں تو دے دو۔ میرا نشانہ ٹھیک ٹھاک لگا ہے۔" ان صاحب نے اطمینان سے جواب دیا۔

فرزانہ شاد - ڈرگ روڈ، کراچی

گاہک ہوٹل کے بیرے سے کہہ رہا تھا۔
"میں اس کمرے میں ہرگز نہیں رہوں گا۔ کیا تم نے مجھے جانور سمجھ رکھا ہے، اس کبوتر خانے میں جس میں صرف ایک اسٹول پڑا ہے، بھلا کوئی رَہ سکتا ہے، تم یہ سمجھتے ہو کہ میں پہلی مرتبہ گاؤں سے شہر آیا ہوں، اس لیے مجھے اُلّو بنا لوگے۔"
"صاحب! یہ کمرہ نہیں لفٹ ہے، جس کے ذریعے میں آپ کو اُوپر آپ کے کمرے میں لیے جارہا ہوں۔"

چوھدری ساجد حسین، کراچی

کتاب فروش (لڑکے سے) "تم روز رسالے اُلٹ پلٹ کر چلے جاتے ہو مگر آج تک تم نے ایک بھی رسالہ نہیں لیا۔"
لڑکا: "واہ جناب۔ میں تو روز ہی ایک دو رسالے لے جاتا ہوں۔ اب آپ کو پتا نہیں چلتا تو میں کیا کروں۔"

خرّم سلیم، فیڈرل بی ایریا، کراچی

"کل تمہارے گھر سے چیخ پُکار کی آوازیں آرہی تھیں، کیا معاملہ تھا؟" ایک شخص نے اپنے پڑوسی سے پوچھا۔
"دراصل میں نے ایک بہت ہی ڈراؤنا خواب دیکھا تھا۔" پڑوسی بولا۔ "میں نے دیکھا کہ کسی نے مجھ پر فائر کیا اور گولی سیدھی میرے چہرے پر لگی، میں اُٹھ کر غسل خانے میں گیا اور آئینے میں دیکھا تو واقعی چہرے پر بڑا سا سوراخ نظر آرہا تھا۔"
اُس شخص نے حیرت سے پوچھا: "پھر کیا ہُوا؟"
"پھر میں نے اپنا منہ بند کر لیا اور سوراخ غائب ہوگیا۔" پہلے آدمی نے جواب دیا۔

عزیز احمد شیخ، میر پور خاص

ایک صاحب ڈاکٹر کے پاس گئے اور کہا "مجھے سخت نیند آتی ہے۔ اس لیے بروقت دفتر نہیں پہنچ سکتا۔ کوئی ایسی دوا دیجیے کہ بروقت دفتر پہنچ سکوں۔ ورنہ مجھے نوکری سے ہاتھ دھونا پڑیں گے۔" ڈاکٹر نے انھیں چند گولیاں دیں اور کہا کہ سوتے وقت ایک گولی کھا لیا کرنا۔
اگلے دن وہ صاحب بروقت اُٹھے اور بہت حیران ہوئے۔ مقررہ وقت سے دو چار منٹ قبل ہی دفتر پہنچ گئے اور افسر سے کہا "سر دیکھیے آج میں وقت پر آفس آگیا ہوں۔"
افسر نے جواب دیا: "یہ تو ٹھیک ہے لیکن یہ تو بتاؤ کہ کل کہاں رہے۔"

خلیل اللّٰہ خان۔ سوات

روس کے صدر ایک ملک میں گئے، وہاں انھوں نے ایک عجائب گھر میں مختلف گھڑیاں دیکھیں۔ اُن کے نیچے ہر ملک کا نام لکھا تھا۔ روس کے صدر نے پوچھا "یہ کیا ہے؟" تو میزبان نے جواب دیا۔

"جس ملک میں جتنا ظلم ہو رہا ہے، اس کو یہ گھڑیاں اپنی سوئیوں کی رفتار سے ظاہر کر رہی ہیں" روس کے صدر نے اِدھر اُدھر دیکھا لیکن انھیں روس کا نام نظر نہیں آیا وہ بہت خوش ہوئے اور میزبان سے کہا "خدا کا شکر ہے کہ روس سے ظلم ختم ہو گیا ہے"

"یہ بات نہیں" میزبان نے جواب دیا۔ "روس کی گھڑی تو باورچی خانے میں پنکھے کا کام دے رہی ہے..."

راجہ راشد بشیر۔ کراچی

ایک دفعہ ایک جن ایک بچّے کے پاس گیا اور اُسے ڈرانے لگا، بچّے نے معصومیت سے پوچھا "تم کون ہو؟" جن نے کہا۔

"میں جن کا بچّہ ہوں"

بچّے نے فوراً کہا "اچھا تو ریڈیو پر تمھارا ہی اعلان ہو رہا تھا، کہ جن کا بچہ ہے آ کر لے جائیں"

نور العارفین۔ جدّہ

بیوی (شوہر سے) "سُنا ہے آپ کے فلسفی دوست سمندر میں ڈوب کر مر گئے"

شوہر "ہاں انہیں ہر چیز کی گہرائی میں جانے کا شوق تھا"

رومانہ مشتاق طور۔ مرادپور

ایک پُل پر کسی سیاسی پارٹی کا اشتہار لگایا گیا۔ کچھ روز بعد اُسی جگہ کسی نے پولٹری فارم کا اشتہار لگایا۔ اب اس جگہ لگائے گئے اشتہارات کچھ یوں پڑھے جا رہے تھے۔

"نوجوانانِ پاکستان پر فرض ہے کہ جان ہتھیلی پر رکھ کر انڈوں کے لیے ہم سے رجوع فرمائیں"

"غدار پولٹری فارم پاکستان"

خلیل اللہ خان۔ سوات

ایک مرتبہ ایک خاتون کمبل کی دکان پر گئیں اور کمبل دیکھنے شروع کیے۔ تھوڑی دیر بعد انھیں احساس ہوا کہ سیلزمین ان کو الماری سے کمبل نکال کر دکھاتے ہوئے بور ہو چکا ہے۔ جب صرف ایک کمبل دکھانے کو رہ گیا تو انھوں نے کہا۔

"مجھے بہت افسوس ہے، اصل میں، میں اس وقت کمبل خریدنے نہیں آئی۔ یہ سب اپنی ایک دوست کے لیے دیکھ رہی ہوں"

"بہت بہتر مادام" سیلزمین نے چڑ کر کہا

بلاعنوان

نہیں ہے؟"

بچہ: "وہ سہیلیوں کے ساتھ پکنک منانے گئی ہیں"

"اگر آپ یہ سمجھتی ہیں کہ آپ کی دوست کمبلوں میں لپٹی ہوئی ہیں تو یہ آخری کمبل بھی دیکھ لیجیے"

محمد شریف احمد - میانوالی

ایک بوڑھے شخص نے ایک دروازے پر دستک دی اندر سے ایک لڑکا باہر آیا۔ اُن دونوں کے درمیان کچھ یوں گفتگو ہوئی۔

بوڑھا: "بیٹا! گھر پر تمہارے ابو ہیں۔

بچہ: "جی نہیں وہ دفتر گئے ہوئے ہیں"

بوڑھا: "اچھا تو امی ہوں گی"

بچہ: "جی وہ پڑوسن کے گھر گئی ہیں"

بوڑھا (کچھ غصے سے) "تو کوئی بڑا بھائی ہوگا"

بچہ: "جناب وہ کرکٹ کھیلنے گئے ہیں"

بوڑھا (مزید غصے میں) "تو کوئی بڑی بہن بھی

بوڑھا: "تو آخر تم گھر میں کیا کر رہے ہو؟"

بچہ: "(معصومیت سے)" میں تو خود اپنے دوست کے گھر کیرم کھیلنے آیا ہوں"

فرحت صلاح الدین - ناتھ ناظم آباد کراچی

ایک شخص کو مشکل الفاظ بولنے اور بات کو طویل کرنے کی عادت تھی۔ ایک دفعہ اپنے دوست کے ساتھ سفر کر رہے تھے کہ اُن کی طبیعت خراب ہوگئی اپنے ساتھ سفر کرنے والے دوست سے بولے۔

"میں اگلے اسٹاپ پر اُتر کر اسپتال جاؤں گا، تم میری بیگم کو پیغام دے دینا کہ میرے سر اور کمر میں درد۔ اعضاء میں تشنج، پاؤں میں ورم، دماغ میں سوجن اور زبان میں لکنت ہوگئی ہے۔"

"اتنی باتیں یاد رکھنا میرے لیے بہت مشکل ہے، میں تو سیدھے الفاظ میں اُنہیں بتادوں گا کہ آپ وفات پاچکے ہیں۔" دوست نے کہا۔

ساجد کمالوی - کمالیہ

انعام یافتہ لطیفہ بھیجنے والے قارئین سے درخواست ہے کہ اپنا مکمل پتہ ارسال کیا کریں تاکہ انھیں بروقت انعام روانہ کیا جاسکے۔ قارئین نوٹ کرلیں کہ اس ماہ سے انعام یافتہ لطیفہ بھیجنے والے ساتھی کو ۳ ماہ تک "آنکھ مچولی" کے بجائے "آنکھ مچولی" کے تازہ شمارے کی ایک کاپی اور "حق اسکواڈ" انعام کے طور پر دی جائے گی۔

بھونچال

شبنمیر بیگ نازؔ

دھڑ دھڑانے لگے در و دیوار   کڑکڑانے لگیں چھتیں، بیمار
مچ گیا شور آگیا بھونچال   دل یکایک ہلا گیا بھونچال
جو تھے سوئے ہوئے وہ جاگ اُٹھے   لوگ باہر گھروں سے بھاگ اُٹھے
کوئی تہہ بند سنبھالتا بھاگا   بچّے کاندھے پہ ڈالتا بھاگا
عورتوں کو نہ ہوش پردے کا   غیر مردوں نہ بال بچّے کا
کیا غریب اور کیا امیر سبھی   گھر سے نکلے ہیں بن کے تیر سبھی
چہرے بھونچال سے ہوئے فق ہیں   قلب انجانے خوف سے شَق ہیں
بدحواسی نے سب کو گھیرا ہے   آنکھ میں موت کا اندھیرا ہے
جو اکڑ فوں تھے وہ بھی نادم ہیں   دل سے اب اپنے رب کے خادم ہیں
سب کے لب پہ دُعائیں جاری ہیں   کپکپاتی صدائیں جاری ہیں
نازؔ قہرِ الیم ہے بھونچال
درسِ ربِّ عظیم ہے بھونچال

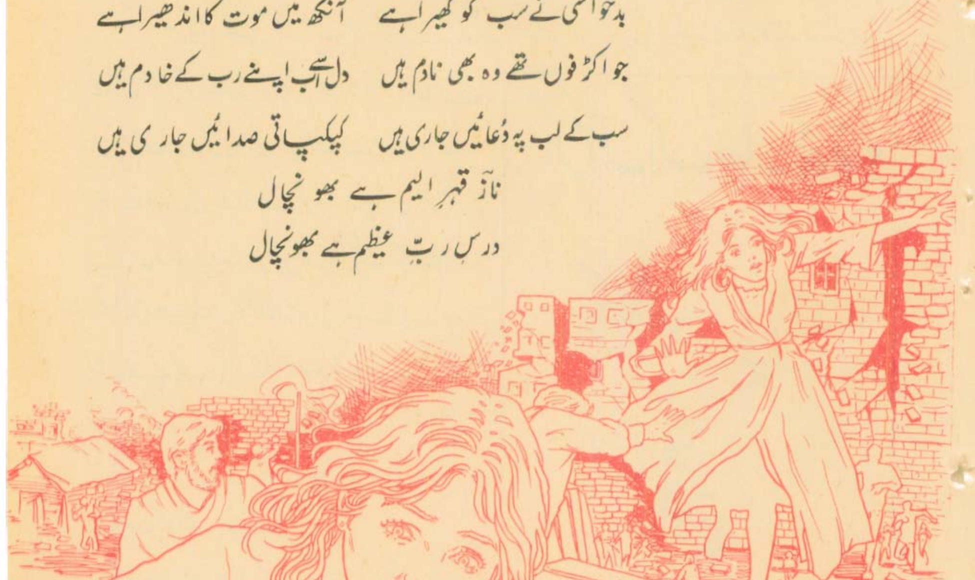

اگر آگ لگ جائے تو؟

نیّر ابدالی

اللّٰہ نہ کرے لیکن اگر کبھی آپ کے گھر میں آگ لگ جائے تو آپ کیا کریں گے؟ یقیناً بیوی اور بچوں کو افراتفری میں گھر سے نکالنے کی کوشش کریں گے۔ تاکہ انہیں آگ سے نقصان نہ پہنچے۔ دنیا بھر میں ہر سال ہزاروں افراد گھروں میں آگ لگنے سے جل کر ہلاک ہو جاتے ہیں اور ہزاروں افراد زخمی ہو کر معذوری کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ عام طور پر بہت کم لوگوں کو معلوم ہوتا ہے کہ آگ لگ جانے کی صورت میں کیا کرنا چاہئے۔ وہ گھبراہٹ اور افراتفری کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اور نقصان سے دوچار ہو جاتے ہیں۔

۱۹۸۲ء میں ایک امریکی گھرانے کے سربراہ نے اپنی بیوی اور بیٹے کے ہمراہ اچانک آگ لگ جانے کی صورت میں بچ کر نکلنے کی ریہرسل کی۔ انہوں نے اپنے دو منزلہ مکان کے نقشے کے مطابق یہ طے کیا کہ آگ لگنے کی صورت میں ہر شخص فلاں دروازے سے نکل کر مکان کے سامنے حصے میں لان میں آئے گا۔ انہوں نے یہ ریہرسل کئی مرتبہ کی۔ اتفاق کی بات کہ مارچ ۱۹۸۴ء میں اُن کے گھر میں سچ مچ آگ لگ گئی۔ مگر ایک منٹ کے اندر اندر پورا گھرانہ گھر کے سامنے لان میں جمع ہو گیا۔ تیسرے منٹ پر فائر بریگیڈ کے عملے نے پہنچ کر آگ پر قابو پا لیا۔ اس طرح حفاظتی تدبیر اختیار کرنے سے پورا گھرانہ جانی نقصان سے محفوظ ہو گیا۔

امریکہ اور یورپ میں آگ سے خبردار کرنے کے لئے "اسموک الارم" تقریباً ہر گھر میں لگا ہوتا ہے۔ دھواں یا تپش محسوس کرتے ہی یہ الارم بجنا شروع ہو جاتا ہے۔

ان اسموک الارم کی بدولت اب آگ سے جل کر ہلاک ہونے والوں کی تعداد گھٹ کر صرف پچاس فیصد رہ گئی ہے۔ عام طور پر جب بھی کسی گھر میں آگ لگتی ہے، تو خواتین اور بچے اس کا شکار جلدی ہو جاتے ہیں۔ وہ یا تو بستر کے نیچے چھپ جانے کو محفوظ خیال کرتے ہیں یا وہ خوف سے اتنے بے جان ہو چکے ہوتے ہیں کہ زندگی بچانے کی جدّ و جہد سے قاصر ہو جاتے ہیں اور آسانی سے موت کا شکار ہو جاتے ہیں۔

اس سلسلے میں امریکہ کے نیشنل فائر پروٹیکشن ایسوسی ایشن کا کہنا ہے کہ "آگ لگنے کی صورت میں اپنے حواس

بجار کھتے ہوئے سب سے پہلے باہر نکلنے کی کوشش کریں۔ یوں بھی آگ پورے گھر میں ایک ساتھ نہیں لگتی۔ بلکہ آہستہ آہستہ ہی پھیلتی ہے۔ چنانچہ کوئی نہ کوئی دروازہ یا کھڑکی جو آگ کے شعلوں سے محفوظ ہو اس سے آسانی کے ساتھ باہر نکلا جا سکتا ہے۔ لہٰذا ہر شخص کو یہ طے کر لینا چاہئے کہ کسی ہنگامی صورتِ حال میں وہ کس راستے سے باہر نکلے گا۔ خاص طور پر دس سال تک کی عمر کے بچوں کو یہ ہدایت کر دی جائے کہ اگر دروازے پر دھواں یا آگ نظر آئے تو وہ اپنے اوسان قابو میں رکھتے ہوئے کرسی کو کھڑکی کے قریب کریں اور کھڑکی کے راستے لان یا گلی میں کود جائیں۔

ایک اہم احتیاط یہ بھی کی جائے کہ سونے سے قبل فالتو بتیاں بجھا دیں اور باورچی خانے میں گیس کے چولہے اور گیس کی لائن کی ٹونٹی بند کر دیجیے۔ تاکہ گیس لیک نہ ہونے پائے۔ گھروں میں بجلی کی ناقص وائرنگ پہلی فرصت میں درست کروالیں۔ عموماً ناقص یا پرانی وائرنگ سے شارٹ سرکٹ کی وجہ سے آگ لگنے کا خطرہ ہوتا ہے۔ ذیل میں ہم اپنے قارئین کو چند احتیاطی تدابیر بیان کر رہے ہیں۔ جن پر عمل پیرا ہو کر وہ آگ سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔

- سوتے وقت دروازوں کو بند کر کے سویا کریں۔ اس طرح آپ شعلوں اور حدت سے محفوظ رہیں گے۔ اگر مختلف کمروں سے ہو کر آپ کو باہر نکلنا پڑے تو اپنے پیچھے دروازے بند کرتے ہوئے باہر نکلیں۔ آگ لگنے کی صورت میں باہر نکلنے کی فکر کیجیے۔ کپڑے بدلنے یا روپے پیسے سمیٹنے کی فکر نہ کریں۔ کیونکہ قیمتی اشیاء اور روپیہ پیسہ آپ کی قیمتی زندگی کا بدل نہیں ہو سکتے۔
- دروازہ کھولتے وقت احتیاط سے کام لیں۔ ایسا نہ ہو کہ دروازہ کھولتے ہی دھوئیں سے آپ کھانس کھانس کر بے حال ہو جائیں۔ یا خوفناک شعلے آپ کا استقبال کریں۔ اگر آپ دیکھیں کہ ہلکا ہلکا دھواں دروازے کی چوکھٹ سے اندر آ رہا ہے یا دروازہ گرم محسوس ہو تو اُسے کھولنے کے بجائے کھڑکی سے باہر نکلنے یا مدد طلب کرنے کی کوشش کریں۔
- اگر آپ کے کپڑوں میں آگ لگ جائے تو گھبراہٹ میں مبتلا نہ ہوں اور نہ ہی دوڑنے بھاگنے کی کوشش کریں۔ بلکہ فرش پر لوٹ لگانا شروع کر دیں۔ اسی طرح کسی دوسرے کے کپڑوں میں آگ لگ جائے تو اُسے فوراً لٹا کر کوئی تولیہ یا کمبل ڈال دیں۔ اگر تولیہ یا کمبل نہ مل سکے تو اُسے فرش پر لوٹ لگانے کو کہیں۔
- جلتے ہوئے مکان سے باہر نکل آنے کے بعد کسی چیز کو اُٹھانے یا لانے کے لئے واپس جانے کی کوشش ہرگز نہ کریں۔ کیونکہ آپ کی یہ کوشش خودکشی کے زمرے میں شمار ہو گی۔
- ہر حال میں اپنے اوسان بحال رکھنے کی کوشش کیجئے۔ کیونکہ اگر صرف اوسان بحال ہوں تو زندہ بچ رہنے کے پچاس فیصد امکانات ہوتے ہیں۔

اُستاد :" وہ کونسی غذا ہے جو لذّت اور توانائی
کے لحاظ سے سب سے آگے ہے
اور جس میں ملاوٹ نہیں کی جاسکتی "
شاگرد :" انڈا " بشرطیکہ امتحان میں نہ ملے "

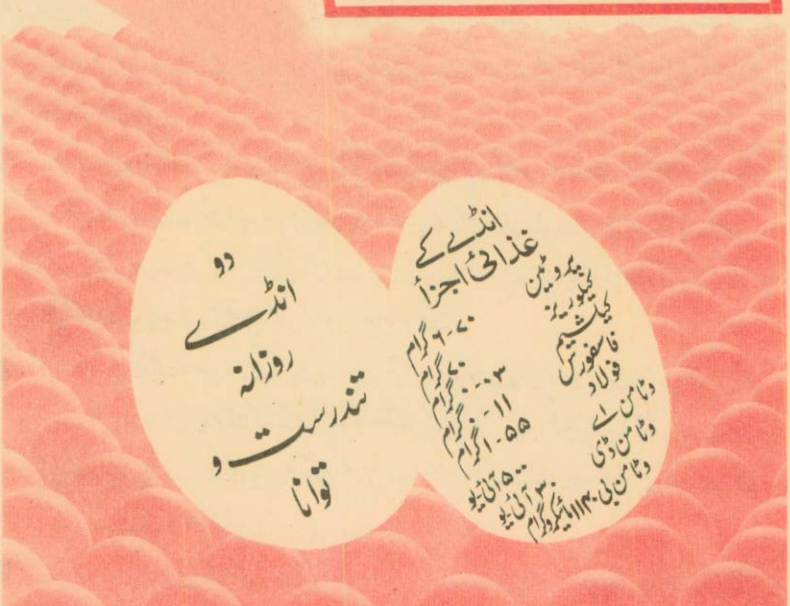

نافرمانی کی تصویر

محمد افتخار کھوکھر

ماں باپ کے نافرمانوں کے لئے ایک سبق آموز کہانی

برگد کے درخت کے نیچے بیٹھا ہوا فقیر ہر آنے جانے والے کے سامنے ہاتھ پھیلائے بلند آواز میں صدا لگاتا۔
"اللہ کے نام پر دے۔" اور پھر آہستہ سے کہتا "اس فقیرِ پُر تقصیر کو، نافرمانی کی تصویر کو۔"
اسکول آتے اور جاتے فقیر کی یہ صدا سُننا سلمان کا معمول تھا۔ جس روز سلمان کے پاس جیب خرچ زیادہ ہوتا۔ اس دن وہ فقیر کے کشکول میں چونی یا اٹھنی ڈال دیتا۔ فقیر دعائیں دیتا تو اُس کا جی خوش ہو جاتا۔ سلمان اکثر سوچتا کہ یہ فقیر بھی ہماری طرح کا انسان ہے، مگر یہ دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلانے پر مجبور کیوں ہے، اور یہ نافرمانی کی

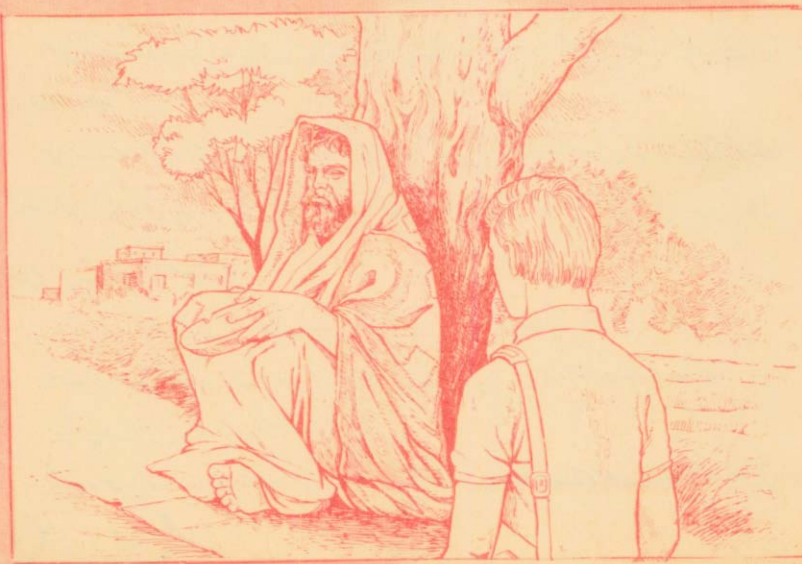

تصویر کا کیا مطلب ہے ؟ یہ سوال تھا جو سلمان کو کبھی کبھار پریشان کر دیتا تھا۔

ایک روز ہاکی ٹیم کی جیت کی خوشی میں، اسکول میں جلدی چھٹی ہو گئی تو تمام بچے خوشی سے شور مچاتے گھر جانے کے لئے اپنی کلاسوں سے سیدھے مین گیٹ کی جانب دوڑے۔ سلمان بھی اُن میں شامل تھا۔ مین گیٹ سے باہر نکل کر جب وہ برگد کے درخت کے قریب پہنچا تو اُس کے کانوں میں فقیر کی مخصوص صدا گونجی "نافرمانی کی تصویر"۔

یہ آواز سلمان روز سُنتا تھا اور بے چین ہو جاتا تھا، آج اس کے قدم نہ جانے کیوں رُکنے لگے تھے، اس کا جی چاہا کہ وہ فقیر کے پاس بیٹھ کر پوچھے کہ وہ یہ صدا کیوں لگاتا ہے۔ پہلے تو سلمان کو ڈر لگا پھر ہمت کر کے فقیر کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ فقیر نے ایک لڑکے کو اپنے قریب دیکھا تو پیار سے کہا "بیٹے! کیا بات ہے، آؤ میرے قریب آؤ" سلمان انجانے خوف کے ساتھ فقیر کے پاس پہنچ تو گیا مگر ڈر کے مارے بھول ہی گیا کہ وہ کیا کہنا چاہتا تھا۔ فقیر نے ایک بار پھر پیار سے کہا "بیٹے ڈرو نہیں، میرے پاس آ کے بیٹھو، کیا بات ہے؟"

فقیر کی پیار بھری آواز سُن کر سلمان کو کچھ حوصلہ ہُوا تو وہ فقیر کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ بات اب بھی اس کے منہ سے نہیں نکل رہی تھی۔

"کیا بات ہے بیٹے؟" فقیر نے پیار سے پوچھا۔

"بات یہ ہے کہ ..." سلمان بات کرتے ہوئے ایک بار پھر جھجک گیا۔

"اچھے بچے ڈرتے نہیں، بتاؤ کیا بات ہے؟" فقیر نے پھر کہا۔

سلمان کو فقیر کے دلاسے سے کچھ ڈھارس بندھی تو اُس نے کہا "آپ ہر روز "نافرمانی کی تصویر کو" کیوں کہتے ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟"

سلمان نے بات ختم کی تو فقیر نے ایک لمبی سرد آہ بھری اور آنکھیں بند کر کے خیالوں میں کھو گیا، جیسے کوئی گمشدہ چیز ڈھونڈھ رہا ہو۔ کچھ دیر اسی طرح گُم سُم رہنے کے بعد سر کو ہلکا سا جھٹکا دیا اور آنکھیں کھول کر سلمان کی طرف دیکھا جو اُس کے جواب کا منتظر تھا۔

"بیٹا! یہ بڑی درد بھری داستان ہے تم سُن کر کیا کرو گے؟" فقیر نے ایک بار پھر سرد آہ بھری۔

خوف اور ڈر کے بجائے سلمان کو اب ہمدردی سی ہونے لگی تھی۔ اُس نے اصرار کرتے ہوئے کہا۔

"بابا آپ مجھے اپنی داستان ضرور سنائیں"

فقیر نے سلمان سے ہمدردی کے چند بول سُنے تو اُس نے گُدڑی پر پھیلے ہوئے پیسوں کو سمیٹتے ہوئے اپنی

داستان اس طرح شروع کی۔

"بیٹا! ایک زمانہ تھا جب میں بھی تمہاری طرح اسکول میں پڑھا کرتا تھا۔ اپنے ابو امی کا بجد لاڈلا تھا۔ اپنی ہر جائز اور ناجائز خواہش منوانا میری عادت تھی۔ یہ عادت آہستہ آہستہ اتنی پختہ ہوگئی کہ جب کبھی ابو امی کسی وجہ سے میری کوئی خواہش پوری نہ کرتے تو خود سر ہوکر اُن کی بے عزّتی بھی کر دیتا۔ مجھے پڑھائی سے زیادہ اپنی فرمائشیں پوری کرانے کا شوق تھا۔ کلاس میں کوئی نیا سوٹ پہن کر آتا تو میں چاہتا کہ اگلے روز ایسا ہی سوٹ میں بھی پہنوں۔ گھر آتے ہی ابو امی کو اپنی فرمائش سے آگاہ کرتا۔ اگر وہ میری بات نہ مانتے تو کھانا کھائے بغیر روٹھ کر اپنے کمرے میں چلا جاتا۔

میری روز روز کی فرمائشوں اور پڑھائی سے جی چرانے پر ابو امی بہت پریشان تھے۔ بچپن کا بے جا لاڈ پیار اب اپنا رنگ دکھا رہا تھا۔ امی اور ابو نے بڑی کوشش کی کہ کسی طرح میری بُری عادتیں چھوٹ جائیں مگر ان کی کوششوں کا ہمیشہ اُلٹا اثر ہوتا۔ میرا دل پڑھائی میں بالکل نہیں لگتا تھا۔ آوارہ دوستوں کے ساتھ گھومنے کی وجہ سے میں نے اسکول سے غیر حاضر ہونا شروع کر دیا۔

اسی دوران شہر میں ہیضہ کی وباء پھیلنے سے میرے ابو اس موذی مرض کا شکار ہو گئے، مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی طرح مرض لاعلاج ہوتا چلا گیا اور ایک دن ایسا آیا، جب ابو مجھے اور امی کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے جُدا ہو گئے۔

ابو کے انتقال نے وقتی طور پر مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ مگر چند دن کے بعد پھر وہی آوارہ دوستوں کے ساتھ گھومنے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ امی کو ابو کی جدائی کے ساتھ ساتھ میری آوارگی کا غم دیمک کی طرح چاٹ رہا تھا۔ مگر میں تمام حالات سے بے پرواہ اپنے ہی حال میں مگن تھا اور پھر ایک شام میرے لئے غموں کا پہاڑ بن کر آئی، جب میری بے توجہی اور بے رُخی کا زخم لے کر امی بھی اس دنیا کو چھوڑ کر ابو کے پاس چلی گئیں۔

میری بے توجہی اور لاپرواہی سے میری زندگی کا آخری سہارا مجھ سے چھن گیا تو ذہنی طور پر مجھے شدید صدمہ پہنچا اس صدمے نے مجھے کہیں کا نہ چھوڑا، لکھنا پڑھنا پہلے ہی چھوڑ چکا تھا۔ کوئی کام کرنا میں جانتا نہیں تھا۔ اس لئے در بدر کی ٹھوکریں کھا رہا تھا۔ ایک دن ہمّت کر کے مزدوری کی تلاش میں گھر سے نکلا تو راستے میں دو آدمی ملے، انہوں نے پوچھا "مزدوری کرو گے"؟

مجھے اور کیا چاہئے تھا، مزدوری کے لئے فوراً تیار ہو گیا۔

دونوں آدمیوں نے اشاروں اشاروں میں نہ جانے کیا بات کی، اور مجھے گاڑی میں بیٹھنے کے لئے کہا۔ گاڑی ایک جھٹکے سے اسٹارٹ ہوئی اور پھر ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ شہر سے دُور ایک علاقے میں بہت بڑی حویلی کے سامنے

کارڑکی تو مجھے کچھ شک ہوا کہ یہ لوگ مزدوری کے بہانے اغواء کرکے تو نہیں لے آئے ۔ ابھی میں انہی سوچوں میں گُم تھا کہ کار کا دروازہ کھُلا اور مجھے حویلی کے اندر چلنے کا حکم ملا ۔

حویلی میں داخل ہوتے ہی کئی بچّوں پر نظر پڑی، کسی کا ہاتھ ٹوٹا ہُوا تھا اور کسی کی ٹانگ کٹی ہوئی تھی ۔ یہ منظر دیکھ کر مارے خوف کے میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا ۔ دونوں آدمی مجھے حویلی میں ایک سجے سجائے کمرے میں لے گئے ۔ جہاں ایک خوفناک چہرے والا آدمی شاہانہ انداز میں بیٹھا دو تین لڑکوں سے اپنے پاؤں دبوا رہا تھا ۔ مجھے دیکھتے ہی بولا " بندہ تو اچھا ہے، کہاں سے لائے ہو؟

"بڑی محنت اور کوشش سے ایسا اچھا مال ڈھونڈھ کر لائے ہیں سردار " دونوں میں سے ایک آدمی نے جواب دیا ۔

خوفناک چہرے والے آدمی نے اپنی جیب سے سو سو روپے کے کئی نوٹ نکال کر مجھے اغوا کرکے لانے والوں کو دیتے ہوئے کہا " اس سے اچھا بندہ لاؤ گے تو اس سے زیادہ رقم ملے گی "

دونوں آدمیوں نے نوٹ اپنی جیبوں میں ٹھونستے ہوئے شکریہ ادا کیا اور وہاں سے چلے گئے ۔

سردار نے اپنے ملازم کو آواز دی کہ مجھے لے جا کر بھیک مانگنے کے طریقے سکھائے جائیں، اگر یہ تنگ کرے تو اس کا بازو یا ٹانگ توڑ دینا ۔ یہ سن کر میں کانپ گیا ۔ اس قلعہ نما حویلی سے فرار ہونا میرے لئے ممکن نہیں تھا، اس لئے میں بے بس اور مجبور ہوکر اُن کی ہر بات مانتا چلا گیا ۔ اور پھر وہ دن اور آج کا دن بھیک مانگنے کی ایسی عادت پڑی کہ اب عمر کے آخری حصّے میں پہنچ گیا ہوں ۔ گزرے ہوئے وقت کو جب یاد کرتا ہوں تو دل خون کے آنسو رونے لگتا ہے ۔ میں خود کو اپنے ابو اور امی کا مجرم اور نافرمان سمجھتا ہوں ۔ جنہیں میں نے اپنی لاپرواہیوں اور نافرمانیوں سے ہمیشہ کے لئے کھو دیا ۔ اب یہ غم میرے جسم و جان کا غم بن چکا ہے ۔ میں لوگوں کے سامنے بھیک مانگنے کے لئے ہاتھ پھیلاتا ہوں، تو بے اختیار یہ صدا لگاتا ہوں ۔

" اللہ کے نام پہ دے ، اس فقیرِ پُر تقصیر کو ، نافرمانی کی تصویر کو "

فقیر نے اپنی درد بھری داستان ختم کی تو سلمان کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو آ گئے ۔ رومال سے آنسو پونچھتے ہوئے سلمان نے فقیر سے کہا ۔

" بابا ! آپ میرے ساتھ میرے گھر چلیں "

" نہیں بیٹا ! اب برگد کا یہ بوڑھا درخت ہی میرا سب کچھ ہے ۔ میں اس کو چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتا ۔ میں اس راستے پر بیٹھ کر آنے جانے والے کو یہ صدا دیتا ہوں کہ میں تو برباد ہُوا ہوں، کوئی اور ماں باپ کی نافرمانی کرکے اپنی دنیا تاریک نہ کرے "

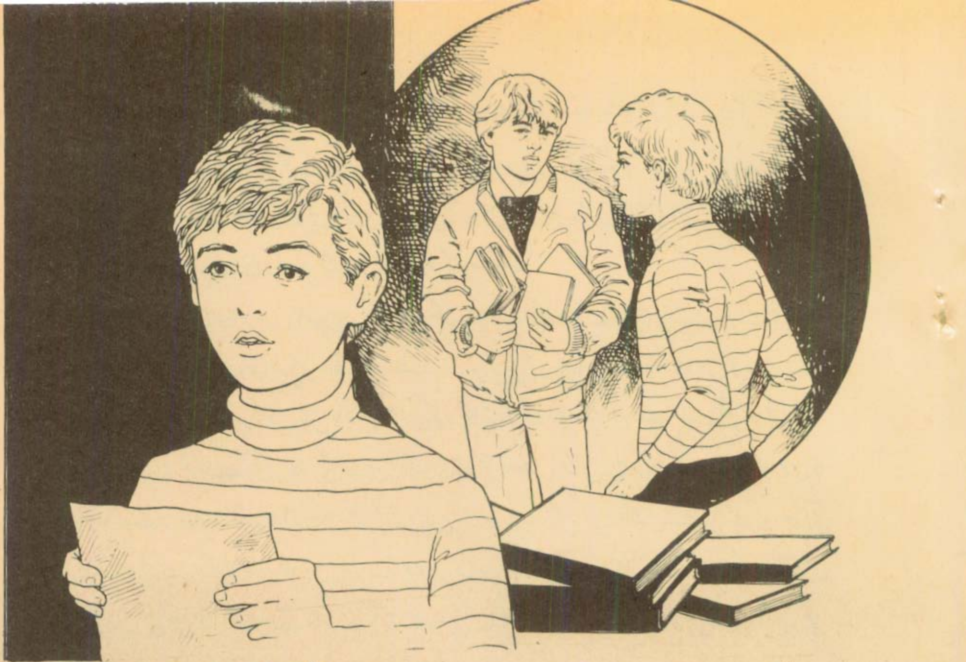

اجنبی دوست

فرحین نگار

اس کی کتاب دوستی ہی اس کے مسئلے کا حل ثابت ہوئی

"ھیلو عامر، کیسے ہو ؟ میں تم سے بہت سخت ناراض ہوں . تم کل کیوں نہیں آئے . اتنا انتظار کیا میں نے . اتنی دیر میں ۔۔۔ کیک کاٹا . آخر تم آئے کیوں نہیں" ؟ عثمان نے جلدی جلدی اپنا سارا غصہ عامر پر نکالتے ہوئے کہا .

"بس یار میں آ ہی نہیں سکا . مغرب کے وقت خالہ جان اپنے بچوں کے ساتھ آگئی تھیں . اتنی دیر میں وہ گئیں پھر ہمارے گھر کے قریب ایکسیڈنٹ بھی ہو گیا تھا" عامر نے عثمان کی بات کا گول مول جواب دیتے ہوئے کہا . لیکن یہ سب کچھ ہونے کے باوجود عثمان کے گھر نہ جانے کی ایک بڑی حقیقت یہ بھی تھی کہ عامر، عثمان کی سالگرہ پہ اُسے کیا تحفہ دیتا . عثمان ایک امیر لڑکا تھا اور اُس کے معیار کا تحفہ دینا عامر کے بس سے باہر تھا . اُس نے اپنے ابّو سے عثمان کے لئے تحفے کے پیسے مانگے تھے لیکن ابّو نے دینے سے صاف انکار کر دیا . اب

اُسے عثمان اتنا بھی عزیز نہیں تھا کہ وہ اپنا گُلک توڑ کر اُس سے عثمان کے لئے کوئی تحفہ خریدتا۔ آخر اُس کی اپنی بھی تو بہت ساری ضرورتیں ہیں جن کی تکمیل کے لئے وہ پیسے جمع کر رہا ہے ۔ اس کے ابو بینک میں ایک معمولی عہدے پر کام کرتے ہیں۔ لیکن اپنے بیٹے کو اعلیٰ افسر بنانے کی خواہش میں وہ اُسے ایک اچھے اسکول میں تعلیم دلا رہے تھے۔ کیونکہ شاید یہ وقت کا تقاضہ ہے۔

"کیا سوچ رہے ہو عامر ... ؟" عثمان نے کہا۔ "یہ دیکھو پاپا نے مجھے رسٹ واچ دی ہے۔ بہت خوبصورت ہے"۔ عامر نے کہا "اور یہ دیکھو صائمہ آپی نے دیا ہے ——— THE ADVENTURES ناولوں کا پورا سیٹ۔ اچھی ہے نا ؟" عثمان نے کہا۔ "ہاں ہاں" عامر کتابوں کو دیکھنے لگا۔ "یہ امی نے دیا ہے اور یہ ننھی عاشی نے کارڈ بنا کر دیا ہے خود سے"۔ لیکن عامر کی نظریں مستقل ایڈونچر ناولوں پر جمی رہیں۔ اُسے ایڈونچر ناولوں کا کتنا شوق ہے۔ اتنا مزہ آتا ہے اُسے اس قسم کی کہانیاں پڑھنے میں۔ لیکن کتنی مشکلوں سے ملتی ہیں یہ، اور مہنگی بھی بہت ہوتی ہیں۔ "دکھاؤ ذرا یہ ناولیں" اُس نے چاروں کتابوں کا مکمل سیٹ لیتے ہوئے کہا، لیکن اتنے میں کلاس کی بیل بج چکی تھی۔ عثمان نے عامر کے ہاتھ سے اپنی کتابیں لیں اور بیگ میں رکھ لیں۔ مبادا کہیں ٹیچر نہ دیکھ لیں۔ اور انہیں سخت ڈانٹ پڑے۔

تفریح میں عامر کلاس سے باہر نہیں گیا اُس نے عثمان سے ایڈونچر ناولوں کا سیٹ لے لیا تھا۔ لیکن تفریح تو صرف آدھے گھنٹے کی ہوتی ہے۔ عامر اس مختصر وقت میں مشکل سے صرف دس صفحے ہی پڑھ سکا تھا۔ بہت ہی دلچسپ کہانی ہے۔

"عثمان تم اس کا پہلا حصہ کل مجھے لا دو میں پڑھ کر تمہیں واپس کر دوں گا" عامر نے عثمان کو کتاب واپس کرتے ہوئے کہا۔ لیکن عثمان نے اس کی سُنی اَن سُنی کرتے ہوئے ناول اپنے بیگ میں رکھ لیا۔

دوسرے دن جاتے ہی عامر نے عثمان سے ناول کے بارے میں پوچھا۔ جواب میں عثمان نے کہا "صائمہ آپی نے اُس سے کہا ہے کہ ساری ناولیں اُن کے سامنے پڑھے اس لئے میں نہیں لایا بلکہ میں تو بھول گیا۔" عثمان کا جواب سُن کر عامر ایک دم بور سا ہو گیا۔ کل سارا دن اُس کی نظروں کے سامنے یہ ناول ہی تو گھومتا رہا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ آہستہ آہستہ کر کے پورا ناولوں کا سیٹ پڑھ لے گا اور اُسے خریدنے کی ضرورت نہیں پڑے گی لیکن شاید عثمان نہیں دینا چاہتا ہے اور حقیقت بھی یہی تھی۔ عامر اُس سے روز پوچھتا اور عثمان ہر روز اُسے ٹال جاتا اور کوئی نہ کوئی بہانہ کر دیتا۔ جب دسویں دن بھی عثمان ناول نہیں لایا تو عامر نے سوچا ٹھیک ہے عثمان نہیں دیتا تو نہ دے میں خود خرید لوں گا۔

اسکول سے واپسی پر وہ کتابوں کی ایک دکان پر رُک گیا۔

"جی آپ کے پاس ایڈونچر ناولوں کا پورا سیٹ ہے؟" عامر نے دوکاندار سے کہا۔
"ہاں ہے۔ یہ دیکھو" دکاندار نے اُسے سیٹ دکھاتے ہوئے کہا۔ یہ بالکل ویسے ہی چاروں ناول تھے جیسے عثمان کو صائمہ آپی نے دیئے تھے۔ "کیا قیمت ہے اس کی" عامر نے پوچھا۔ "ایک ناول ایک سو تیس روپے کا اور اگر چاروں لیں تو رعایت پر پانچ سو روپے کی مل جائیں گی۔"
"پانچ سو روپے" عامر نے چیخ کر پوچھا۔
"ہاں۔ ہاں، مہنگی نہیں ہیں" دکاندار نے کہا: بھئی یہ انگلینڈ سے چھپ کر آئی ہیں۔ ان کا کاغذ اور جلد بندی بھی تو دیکھیں۔ اس کی کہانی بھی بہت دلچسپ ہے۔"
"لیکن میں یہ کیسے خرید سکتا ہوں" عامر نے کتابیں واپس کرتے ہوئے سوچا۔
"امی تو مجھے کبھی بھی پانچ سو روپے نہیں دیں گی۔ کاش میری بھی صائمہ آپی جیسی کوئی بڑی بہن ہوتیں۔ جو مجھے بھی سالگرہ پر ایڈونچر ناولوں کا پورا سیٹ دیتیں۔ لیکن خیر۔ میں اپنا گلک توڑ کر ناول خریدوں گا۔ اور ضرور خریدوں گا۔ پیسے جمع کروں گا اور ایک ایک کرکے پورا سیٹ جب مکمل ہوجائے گا تو عثمان کو ضرور دکھاؤں گا۔"
سارے راستے عامر سوچتا ہی رہا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی اُس نے اپنا بیگ ایک کونے میں پھینکا اور سیدھے اپنے کمرے میں جاکر اُس نے نیچے والی دراز سے گلک نکالا۔ وہ اپنا گلک بہت چھپا کر رکھتا تھا۔ کہ کہیں چھوٹے بہن بھائی اُس میں سے پیسے نہ نکال لیں۔ گلک کے سارے پیسے نکال کر اُس نے گنے تو عامر ایک دم اُداس ہوگیا۔ کیونکہ یہ تو کُل اسی روپے تھے باقی بیاسی روپے کہاں سے آئیں گے؟ امی سے مانگ کر دیکھتے ہیں شاید وہ دے دیں"۔ لیکن وہی ہُوا جس کا عامر کو یقین تھا۔ امی نے پیسے دینے سے منع کر دیا تھا۔ اُن کا کہنا تھا کہ اپنے اسکول کی لائبریری میں جاکر تلاش کرو وہاں سے مل جائے گی اور اگر نہیں تو پھر صبر کرو۔
دوسرے دن عامر نے اسکول کی لائبریری میں بیٹھ کر ناولوں کا سارا کیٹلاگ دیکھا لیکن ایڈونچر ناولوں کا وہ والا سیٹ جو عثمان کے پاس تھا اور جو اس نے کتابوں کی دکان پر دیکھا تھا کہیں نظر نہیں آیا۔ ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے عامر نے سوچا کہ شاید یہ ایڈونچر ناول میری قسمت میں نہیں ہیں۔ سارا دن اس کا دل پڑھائی میں نہیں لگ سکا۔ بار بار اُنہیں ناولوں کی طرف اس کا ذہن جا رہا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ یہ ہونے لگا کہ عامر روزانہ واپسی پر کتابوں کی دکان کے راستے سے واپس گھر آتا اور ایک نظر اُس سیٹ پر ڈالتے ہوئے واپس آجاتا۔ اُسے لگتا تھا کہ کہیں یہ ناولیں اُس کی کمزوری نہ بن جائیں۔ پھر ایک دن عامر کو ایک خیال آیا۔ اُس نے ایک خط ایک اجنبی دوست کے نام لکھا۔ اس نے لکھا کہ

"محترم اجنبی دوست

السلام علیکم

میرا نام عامر ہے اور میں آٹھویں کلاس کا طالبعلم ہوں۔ مجھے ناولوں کا یہ سیٹ بہت پسند ہے۔ میں اسے خریدنا اور پڑھنا چاہتا ہوں لیکن میرے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں۔ آپ یہ نہ سمجھیں کہ میں یہ ناولیں آپ سے مانگ رہا ہوں۔ بس اتنی درخواست ہے کہ آپ مجھے یہ ناولیں پڑھنے کے لئے دے دیں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ یہ ناولیں آپ کو بہت احتیاط سے پڑھ کر بحفاظت واپس کر دوں گا۔ میرا پتہ یہ ہے۔

عامر خان۔ بلاک نمبر اے۔ نارتھ ناظم آباد، کراچی۔

شکریہ

عامر خان"

عامر نے اس طرح کے چار خط لکھے اور ایک دن اسکول سے واپسی پہ کتابوں کی دکان پر رُکتے ہوئے اُس نے چپکے سے ایک ایک خط ہر کتاب میں رکھ دیا۔ اب اُس کا دل کسی حد تک مطمئن تھا۔ تقریباً ایک مہینے تک اُس نے اپنے خط کے جواب کا انتظار کیا۔ کیونکہ ناولوں کا یہ سیٹ اب کتابوں کی دکان سے بھی غائب ہو چکا تھا۔ یقیناً کوئی خرید چکا تھا لیکن خط کا جواب ابھی تک نہیں آیا تھا۔

پھر یہ ہُوا کہ عامر کے سالانہ امتحانات نزدیک آ گئے اور وہ سب کچھ چھوڑ کر سچے دل کے ساتھ پڑھائی میں مصروف ہو گیا...

عامر کے امتحانات ختم ہوئے ایک ہفتہ ہو چکا تھا کہ ایک دن اُسے ایک خط موصول ہوا۔ خط میں لکھا تھا۔

"ڈیئر دوست عامر

السلام علیکم

میں تمہارا وہی اجنبی دوست ہوں جس کے پاس ایڈونچر ناولوں کا پورا سیٹ ہے لیکن یہ ناولیں حقیقتاً میری نہیں ہیں پھر بھی میں انہیں تمہیں پڑھنے کے لئے دے سکتا ہوں۔ مقررہ مدت تک کے لئے وہ اس طرح کہ تم ہماری لائبریری کی ممبر شپ حاصل کر و تمہیں نہ صرف ایڈونچر کی بلکہ اور بھی بہت سی جاسوسی، مزاحیہ ناولیں اور معلوماتی کتابیں بھی ملیں گی جن کو پڑھ کر نہ صرف تمہاری معلومات میں اضافہ ہوگا بلکہ تمہیں اور پڑھنے کا بھی شوق پیدا ہوگا۔۔

صرف تمہاری خاطر ایڈونچر ناولوں کا یہ سیٹ سب سے پہلے تمہارے نام جاری کیا جائے گا۔

فقط۔ لائبریرین۔ احمد علی۔ ویلکم لائبریری، کراچی"

خط پڑھ کر عامر خوشی سے اُچھل گیا اُس نے دوسرے ہی دن جاکر لائبریری کی ممبر شپ حاصل کی۔ اب اُس کے پاس ہر وقت مختلف کتابیں رکھی رہتی ہیں۔ جنہیں خریدنے کی اب اُسے ضرورت نہیں رہی تھی۔ اور وہ اس کی معلومات میں بھی اضافہ کر رہی ہیں۔ تو بچو! کیا تم لوگ بھی لائبریری جاتے ہو ؟

ماں

شاھنواز فاروقی

ماں کا آنچل
دُھوپ میں بادل

⊙

ماں کی باہیں!
نیند کی راہیں

⊙

ماں کا دامن!
ہنستا ساون!

⊙

ماں کی انکھیاں!
آس کی سکھیاں

⊙

ماں کا غُصّہ
پیار کا حِصّہ

⊙

ماں خود کیا ہے؟
صرف دُعا ہے!

⊙

ایسی دُعا ہے
جس کی فضا ہے

⊙

سُندر، سُندر!
مہکی، مہکی!

⊙

خوف کی اِک اور وادی کا سفر
ہو رہا ہے آپ کے اِصرار پر

پہلے سے زیادہ خوفناک کہانیوں، واقعات، حادثات اور مضامین کے جلوس کے ساتھ

آنکھ مچولی
کا ایک اور
خوفناک نمبر

لفظ لفظ خوف سے تھرتھراتا ہوا ۔ حرف حرف ہیبت سے پھڑپھڑاتا ہوا
جنوری ۱۹۹۰ء میں شائع ہو رہا ہے۔

آئندہ ماہ
آنکھ مچولی کا خوفناک نمبر اور
ایک حسین تحفہ خرید نا نہ بھولئے ۔ ۔ ۔

خاص نمبر کی قیمت صرف ۱۵ روپے

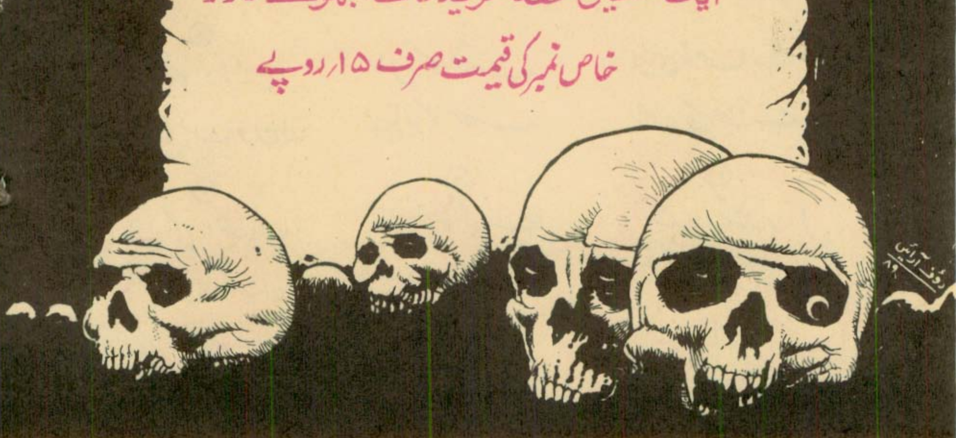

قاسم جب پہلے دن عرفان صاحب کے گھر آیا تھا تو وہ دو روز سے بھوکا تھا۔ چہرے پر زردی چھائی ہوئی تھی اور لباس میلا کچیلا ہو رہا تھا۔ وہ روزگار کی تلاش میں ڈھاکہ سے دھکے کھاتا ہُوا کسی نہ کسی طرح کراچی پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ ان ہزاروں بنگالیوں کی طرح جو غیر قانونی راستے سے پاکستان چلے آ رہے تھے۔ یہ قاسم کی خوش نصیبی تھی کہ اُس کی ملاقات اتفاقاً عرفان صاحب جیسے نیک دل انسان سے ہو گئی تھی اور وہ اُسے اپنے گھر لے آئے تھے۔ اب قاسم انہی کے ہاں رہتا تھا اور گھر کے کام کاج کیا کرتا تھا۔ عرفان صاحب کی اکلوتی بیٹی روما کو قاسم کے آنے کی بہت خوشی تھی۔ کیونکہ اسے کھیلنے کے لئے ایک ساتھی مل گیا تھا۔

عرفان صاحب خود بھی مشرقی پاکستان سے آئے تھے۔ شروع میں تو ان کے حالات انتہائی ناساز گار رہے۔۔ لیکن دن رات کی بھاگ دوڑ اور بے پناہ محنت کے بعد وہ اپنا چھوٹا موٹا کاروبار جمانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ اور رفتہ رفتہ ان کے معاشی حالات بہتر ہوتے جا رہے تھے۔ عرفان صاحب کی بیگم کو البتہ قاسم سے خدا واسطے کا بیر تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ قاسم بنگالی تھا۔ اور بیگم عرفان کے دو بھائیوں کو مشرقی پاکستان کے ہنگاموں میں بنگالیوں نے قتل کر دیا تھا۔ اور یہ زخم ایسا تھا جو کسی صورت بھی نہیں بھر سکتا تھا۔ خود عرفان صاحب کے بڑے بھائی عادل

وہ واپس آئیں گے

طاہر مسعود

اپنے خاندان سمیت اب تک ڈھاکے کے کیمپ میں پڑے ہوئے تھے۔ لیکن عرفان صاحب دوسری طرح کے انسان تھے۔ اور سب کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکنے کے قائل نہ تھے۔ وہ جانتے تھے کہ قاسم تو خود حالات کا مارا ہُوا ہے۔ وہ ڈھاکہ سے چار ہزار روپے ایک ایجنٹ کو دے کر کراچی کے لئے روانہ ہُوا۔ ایجنٹ دھوکہ باز نکلا۔ راستے بھر کسی نہ کسی بہانے اُس سے پیسے اینٹھتا رہا اور پھر کلکتہ میں پولیس کے خوف سے قاسم کو چھوڑ کر ہی بھاگ گیا۔ قاسم کو کئی روز تک حوالات کی ہَوا کھانی پڑی۔ اور وہ جیسے تیسے پاکستان پہنچا۔ اس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے قاسم کی آنکھیں بھر آتی تھیں۔ جب وہ اپنی داستانِ غم سُنا رہا تھا تو بیگم عرفان نے چڑ کر پوچھا۔

"مگر تمہیں پاکستان آنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ تم لوگوں کا اپنا مُلک بَن گیا تھا تو وہیں رہتے۔"

جواب میں قاسم نے اپنے پیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "اس کے لئے بیگم شاحبہ۔"

"پہلے تو تم لوگ کہتے تھے کہ مغربی پاکستان نے تم لوگوں کو بھُوکا رکھا ہے۔" بیگم عرفان نے جرح کی۔

"بیگم شاحبہ" قاسم نے ذرا جوش سے کہا: "ہمارے نیتا (لیڈر) نے جھُوٹ بولا تھا۔ بانگلا دیش (بنگلہ دیش) بنا تو ہم کو کچھ نہیں مِلا۔ ہم پوہلے (پہلے) بھی گوریب (غریب) تھا۔ اب بھی گوریب ہے۔"

"میاں! تم انڈیا چلے جاتے۔ اس نے تو تم لوگوں کو آزادی دلائی تھی۔" بیگم عرفان بولیں۔

"آپ کیا بات کرتا ہے؟" قاسم نے کہا: "ہم کو مورنا تھا کیا۔ اُدھر انڈیا میں چاکری کدھر مِلتا ہے۔ پبلک ہمارا مافک گوریب ہے۔"

"بیگم تم بھی عجیب ہو۔" عرفان صاحب نے تنگ آکر مداخلت کی۔ "نوکروں سے سیاسی بحثیں کرتی ہو۔"

اس بات پر بیگم عرفان بھڑک اُٹھیں، کہنے لگیں: "آپ چُپ رہئے۔ مجھے آپ کا یہ بنگالی نوکر ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ ایک تو آپ اسے پتا نہیں کہاں سے اُٹھا لائے اور پھر چاہتے ہیں کہ میں اس سے پوچھ تاچھ بھی نہ کروں۔"

قاسم ہوشیار تھا سمجھ گیا۔ کہ اب میاں بیوی میں اس کے مسئلے پر جنگ ہونے والی ہے۔ جلدی سے عرفان صاحب سے بولا: "شاب! چائے پیئے گا؟"

"ہاں بھئی ... خوب یاد دلایا۔ فٹافٹ چائے پلاؤ۔"

روما جو بیٹھی یہ ساری گفتگو غور سے سُن رہی تھی اور کچھ باتیں اس کی سمجھ میں آئی تھیں اور کچھ نہیں آئی تھیں ... عرفان صاحب کا کندھا ہلا کر پوچھا۔

"ابو... یہ بنگالی بہت بُرے ہوتے ہیں؟"

"نہیں بیٹے ایسی بات نہیں ہے۔ بنگالی بھی انسان ہیں۔ ہمارے مسلمان بھائی ہیں۔"

"تو پھر امی بنگالیوں کو اتنا بُرا کیوں کہتی رہتی ہیں؟"

عرفان صاحب کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ روما کے اس سوال کا کیا جواب دیں۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب سوچتے۔ روما نے اگلا سوال جڑ دیا۔

"بنگالیوں نے ہمارے دونوں ماموں کو کیوں مارا تھا ابو؟"

"روما! وہاں بنگال میں ہنگامے ہوئے تھے نا تو ہنگاموں میں تو لوگ قتل ہو ہی جاتے ہیں" عرفان صاحب نے ٹالنا چاہا۔

یہ سنتے ہی بیگم عرفان کا پارہ چڑھ گیا تھا۔ چیخ کر بولیں "جھوٹ کیوں بولتے ہیں آپ۔ سچ سچ کیوں نہیں بتاتے کہ اس لئے شہید کیا تھا کہ وہ پاکستانی تھے، پاکستان سے محبت کرتے تھے" عرفان صاحب چپ رہے۔ ان کا سر جھک گیا تھا۔

"ابھی تم چھوٹی ہو روما" تھوڑی دیر بعد انہوں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "جب تم بڑی ہو جاؤ گی تو تمہاری سمجھ میں ساری باتیں آجائیں گی۔ اچھا اب تم جاؤ اور کھیلو"

روما اٹھ کر چلی گئی۔ لیکن قاسم کے ساتھ کھیلتے ہوئے وہ سوچتی رہی کہ امی قاسم کو کیوں ناپسند کرتی ہیں؟ کیا قاسم برا آدمی ہے۔ کیا بنگالی بہت برے ہوتے ہیں اور یہ کہ امی کے دونوں بھائیوں کو بنگالیوں نے کیوں مار دیا تھا۔؟ بات یہ تھی کہ روما کراچی میں پیدا ہوئی تھی اور اسے کچھ علم نہیں تھا کہ سترہ اٹھارہ سال پہلے اس کے والدین مشرقی پاکستان میں کن مظالم کا شکار ہوئے تھے۔ وہ یہ ساری باتیں جاننا چاہتی تھی۔ لیکن گھر میں اسے کوئی بھی یہ باتیں نہیں بتاتا تھا۔

گھر کے احاطے میں روما قاسم کے ساتھ کرکٹ کھیل رہی تھی۔ جب وہ کھیلتے کھیلتے تھک گئی تو گھاس پر بیٹھ گئی پھر ایک دم اسے خیال آگیا اس نے پوچھا۔

"قاسم تم جانتے ہو کہ بنگالیوں نے میرے ماموں کو کیوں مارا تھا؟"

قاسم ایک لمحے کے لئے لڑکھڑا گیا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ روما کوئی ایسا سوال بھی کر سکتی ہے۔

"وہ سب بدمعاش لوگ تھا بے بی۔ ایک دم بدمعاش" قاسم نے کہا۔

"کیا سارے بنگالی بدمعاش ہوتے ہیں؟" روما نے معصومیت سے پوچھا۔

"بے بی... کیا ہم آپ کو بدمعاش لگتا ہے؟" قاسم نے سوال کیا۔

"نہیں... تم تو بہت اچھے آدمی ہو۔ میرے سارے کام کر دیتے ہو۔ میرے ساتھ کھیلتے بھی ہو"

"روما...." اچانک امی کی آواز آئی اور وہ بھاگ کر اندر چلی گئی۔

اگلی سہ پہر دفتر سے لوٹنے کے بعد عرفان صاحب چائے پی رہے تھے کہ بیگم عرفان کو جیسے کچھ یاد آگیا۔

"آپ کا خط آیا ہے۔ شاید عادل بھائی کا ہے" انہوں نے بند لفافہ لاکر عرفان صاحب کے حوالے کیا۔ روما بھانپ گئی کہ اب ابو خط پڑھ کر اُداس ہو جائیں گے۔ کیونکہ جب بھی عادل چچا کا خط آتا تھا ابو کئی روز تک ڈسٹرب رہتے تھے۔ اور یہی ہُوا۔ ابو لفافہ کھول کر جیسے جیسے خط پڑھتے گئے اُن کے چہرے کا رنگ بدلتا گیا۔ روما نے عادل چچا کے خط کبھی نہیں پڑھے تھے۔ اُسے ہمیشہ تجسس رہتا تھا اور وہ جاننا چاہتی تھی کہ آخر ان خطوں میں کیا لکھا ہوتا ہے جو ابو کے لئے اتنے تکلیف دہ ثابت ہوتے ہیں۔ روما نے دیکھا کہ خط پڑھنے کے بعد ابو تیزی سے اُٹھے اور کمرے میں چلے گئے۔ پھر امی بھی اُن کے پیچھے پیچھے چلی گئیں۔ وہ ایک لمحے کے لئے رُک کر سوچتی رہی پھر دبے قدموں کمرے کے دروازے کے پیچھے جاکر کھڑی ہوگئی۔ اس نے اندر جھانکا۔ ایک عجیب ہی منظر تھا۔ ابو دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپائے ہوئے تھے۔ اور اُن کے پورے جسم پر لرزہ طاری تھا۔ ابو رو رہے تھے۔ بے آواز، خاموشی سے۔ امی افسردگی سے اُن کے پاس بیٹھی تھیں۔ روما پلٹی۔ کھُلا ہُوا خط اب بھی کرسی پر پڑا تھا۔ اُس نے تیزی سے جاکر خط اُٹھا لیا اور پڑھنا شروع کیا۔

ڈھاکہ ۲۸، اکتوبر ۱۹۸۹ء

محترم بھائی جان، آداب

ڈیڑھ مہینے ہوگئے آپ کا کوئی خط نہیں ملا۔ طبیعت پریشان ہے۔ خدا کرے آپ سب لوگ خیریت سے ہوں، اپنا حال لکھیں، زندگی کے دن جیسے تیسے پورے ہو رہے ہیں۔ پچھلے دنوں کیمپ میں بیماری پھُوٹ پڑی تھی۔ باری باری سب ہی اس کی لپیٹ میں آئے۔ منا کی حالت تو اتنی خراب ہوگئی کہ ہم لوگ اس کی زندگی سے مایوس ہوگئے تھے۔ یہاں دوپہر کا کھانا مل جائے تو رات کی خبر نہیں ہوتی۔ اس لئے ڈاکٹر کی فیس اور دوا دارُو کے پیسے کہاں سے آئیں۔ اللہ نے کرم کیا اور ہومیوپیتھک علاج سے افاقہ ہُوا۔ کیمپ کا انتظام دن بہ دن خراب ہوتا جا رہا ہے۔ گندگی کے ڈھیر، گندی نالیاں، مکھیوں اور مچھّروں کی یلغار، بیماریاں نہ پھیلیں تو اور کیا ہو۔ اب تو پاکستان واپسی کی امید بھی ختم ہوتی جا رہی ہے۔ خدا جانے ہمیں کس جُرم کی سزا مل رہی ہے۔

منا جلتے بخار میں پوچھ رہا تھا "بابا! ہم پاکستان کب جائیں گے؟"

میں نے اُسے تسلی دی "فکر نہ کرو بیٹے۔ ہم بہت جلد چلیں گے"

میں اُسے کیا بتاتا کہ پاکستان کو ہماری فکر ہی کب ہے۔ سترہ اٹھارہ سال ہونے کو آئے ہیں۔ ایک نسل پیدا ہوکر جوان ہوگئی ہے۔ ہمارا اپنا حال یہ ہے کہ خبر نہیں کہ کب آنکھیں بند ہو جائیں۔ عزت کی زندگی تو نہ مل سکی۔ عزت کی موت بھی شاید نصیب نہ ہو۔

بھائی جان! آپ کو تو یاد ہوگا۔ پاکستان بناتے وقت ہم لوگ کتنے پُرجوش تھے۔ گلی گلی میں نعرے لگاتے

پھرتے تھے "لے کے رہیں گے پاکستان۔ بٹ کے رہے کا ہندوستان" اور ہمارے ان نعروں کو سُن کر ہندوؤں کی آنکھوں میں کیسا خون اُتر آتا تھا۔ اور وہ دن جب قائدِ اعظمؒ ہمارے شہر میں آئے تھے۔ اور اپنی تقریر میں کہا تھا "یاد رکھئے! پاکستان آپ ہی کا نہیں، دُنیا بھر کے مسلمانوں کی پناہ گاہ ثابت ہوگا" اس تقریر کے بعد تو ہم لوگوں میں جیسے نئی زندگی پیدا ہوگئی تھی اور ہم پہلے سے بھی زیادہ جوش و خروش سے تحریکِ پاکستان میں شریک ہوگئے تھے۔ اور آپ کو یاد ہوگا پاکستان بننے کا اعلان ہوتے ہی ہندو بلوائیوں نے مسلمانوں کی بستیوں پر حملے شروع کردیئے تھے۔ ہماری بستی پر بھی حملہ ہُوا تھا۔ میرے سر پر تو آج بھی ہندو بلوائی کے گنڈا سے کا نشان موجود ہے۔ مجھے وہ مُردہ جان کر چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ آپ تو علی گڑھ میں زیرِ تعلیم تھے اور آپ کو کسی نے اطلاع دی تھی کہ آپ کا سارا خاندان شہید کردیا گیا ہے اور یہ سُن کر آپ اُدھر ہی سے پاکستان چلے گئے تھے اور ہم لوگ زخموں سے چُور لُٹی پٹی حالت میں مشرقی پاکستان پہنچے تھے۔ اُس وقت ہمیں کیا معلوم تھا کہ پچیس تیس سال بعد ہمیں ایک بار پھر اپنے ہی بنگالی بھائیوں کے ہاتھوں لُٹنا اور قتل ہونا پڑے گا۔ بے آسرا کیمپوں میں پڑا رہنا ہوگا۔

بھائی جان! میں سوچتا ہوں ہم بار بار تباہ و برباد ہوئے۔ مگر آخر کس کے لئے۔ اسی پاکستان کے لئے۔ ہمارا جُرم کیا تھا؟ ایک پاکستان سے محبّت۔ آج لوگ بھُول چکے ہیں کہ جب اسی پاکستان کو توڑنے کی ناپاک کوششیں کی جارہی تھیں تو اُسے بچانے کے لئے کس نے اپنا جان و مال آل و اولاد سب کچھ قربان کردیا۔ جب عوامی لیگ کے غنڈے پاکستانی پرچم کو جلا کر ہر جگہ بنگلہ دیش کا پرچم لہرا رہے تھے تو کس نے اُس وقت بھی اپنے گھروں پر پاکستانی پرچم لہرائے رکھا۔ اور جب پاکستانی فوج بھارتی تخریب کاروں کی تلاش میں رستے گھاٹ سے بے خبر بھٹکتی پھر رہی تھی تو اُنہیں راستہ کون بتاتا تھا۔ یہ وہی لوگ تھے جنہیں قبول کرنے کے لئے آج پاکستانی حکومت تیار نہیں ہے۔ جنہیں پاکستانی کہنے کے بجائے "بہاری" کہہ کر گویا گالی دی جاتی ہے۔

پچھلے دنوں پاکستانی وزیرِاعظم آئیں۔ ہم لوگ وفد کی صورت میں ان سے ملنا چاہتے تھے، لیکن قدرت کی ستم ظریفی دیکھئے وہ مُکتی باہنی کے غنڈوں کی قبروں پر تو گئیں اور ہم پاکستانیوں کی تواضع پولیس کی لاٹھی اور ڈنڈوں سے کی گئی۔ اس سے زیادہ اور کیا لکھوں۔ اپنی زندگی تو بُری بھلی کٹ ہی گئی۔ اب فکر بچّوں کی ہے۔ ان کا کیا ہوگا؟ ان کے دلوں میں پاکستان کی محبّت اور پاکستان جانے کی جو تمنّا ہے۔ نہیں معلوم اگر یہ تمنّا ہماری زندگی میں پوری نہیں ہوئی تو ہمارے بعد یہ بچّے، پاکستان کے بارے میں کیا سوچیں گے؟ ابھی تو انہوں نے کیمپوں پر اپنے ہاتھوں سے پاکستان کا پرچم لگا رکھا ہے اگر کبھی ان ہی ہاتھوں سے یہ پرچم اُترا تو ہماری عمر بھر کی کمائی پر پانی پھر جائے گا۔ پاکستان سے والہانہ عشق ہی تو ہماری کُل جمع پُونجی ہے۔ جمع پُونجی بھی نہ رہی تو سمجھو ساری قربانیاں رائیگاں چلی گئیں۔

اچھا اب خط ختم کرتا ہوں۔ ہو سکے تو جواب جلدی دیجئے گا۔ وطن سے خط آتا ہے تو ہم بے سہاروں کو۔ بڑا

سہارا ملتا ہے ۔ آپ کا بد نصیب بھائی ۔ عادل ۔ ________

خط پڑھ کر ہمیشہ کی طرح روما کی سمجھ میں کچھ باتیں آئیں اور کچھ نہیں آئیں۔ لیکن ایک بات تو وہ جان ہی چکی تھی۔ قاسم اچھا آدمی نہیں ہے ۔ وہ تیز تیز چلتی ہوئی ابو کے کمرے میں گئی ۔

"ابو" اُس نے بلند آواز میں کہا ۔

"کیا بات ہے روما" ابو کی آواز میں نرمی تھی ۔

"ابو... قاسم کو نوکری سے نکال دیجئے" ۔

عرفان صاحب ایک لمحے کے لئے خاموش رہے ۔"تو تم نے اپنے چچا کا خط پڑھ لیا ہے " انہوں نے رُک رُک کر کہا: " دیکھو بیٹی ... قاسم بے قصور ہے ۔ قصور دار تمہارے عادل چچا ہیں ۔ انہوں نے پاکستان سے محبت ہی کیوں کی "؟

"پاکستان سے تو مجھے بھی محبت ہے ابو ۔ پاکستان تو ہمارا ملک ہے " رومانے کہا۔

"شاباش !" ابو نے شفقت سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا: " تو پھر سنو روما ۔ تمہارے عادل چچا واپس آئیں گے ۔ اور وہ سارے لوگ واپس آئیں گے جو وہاں پھنسے ہوئے ہیں۔ پاکستان انہیں ضرور بُلائے گا ۔ کیونکہ پاکستان کو اُن کی ضرورت ہے ۔ پاکستان کو پاکستان سے محبت کرنے والوں کی ضرورت ہے ۔ ٹھیک ہے "؟

" بالکل ٹھیک " رومانے مسکرا کر کہا ۔ اس وقت بھی ابو کی آدھی بات اُس کی سمجھ میں آئی اور آدھی نہیں آئی تھی ۔

آنکھ مچولی ایک سال تک مُفت حاصل کیجیے

اک ذراسی زحمت سے آنکھ مچولی کے دو سالانہ خریدار بنائیے اور خود سال بھر تک ہر ماہ آنکھ مچولی مفت حاصل کیجیے۔ آنکھ مچولی رسالۂ ادب بھی ہے اور جریدۂ علم بھی ۔ اس کی خوبیاں اپنے دوستوں سے بیان کیجیے اور انہیں آنکھ مچولی کے حلقۂ دوستی میں شامل کیجیے ۔ یہ علم دوستی بھی ہوگی اور ایک بڑا علمی فائدہ بھی ۔

طریقۂ کار جاننے کے لیے خصوصی بچت اسکیم کا صفحہ دیکھیے

مقابلۂ خطاطی

اللہ تعالیٰ کے اسمائے حُسنیٰ اور مصوّری کے ذریعے بچوں کا اظہارِ عقیدت

ہم نے گذشتہ ماہ اسمائے حسنیٰ کے حوالے سے جس مقابلۂ خطاطی کا اعلان کیا تھا۔ اس میں ہماری توقع سے بڑھ کر ساتھی شریک ہوئے خطاطی کے ایک سے ایک نمونے دیکھ کر بے انتہا خوشی ہوئی۔ شرکاء کی تعداد چونکہ بہت زیادہ تھی اس لئے نتیجے تک پہنچنے میں دشواری پیش آئی۔

انعامات کا فیصلہ یوں ہی نہیں ہو گیا بلکہ خطاطی کے راز و رموز کو سمجھنے والے ہمارے محسن محترم جناب ملک نواز احمد اعوان صاحب نے کافی باریک بینی کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے۔ جو اصولی اور تکنیکی اعتبار سے درُست ہے۔ بہت سے اچھے نمونے محض تکنیکی خامیوں کی وجہ سے انعام نہ پا سکے۔

خطاطی کے تمام نمونوں کا بہ یک وقت شائع کرنا ہمارے لئے ممکن نہیں، تاہم منتخب نمونے اور بعض بہترین نمونوں کے بھجوانے والوں کا نام شائع کیا جا رہا ہے۔ اول دوم سوم کے علاوہ ایک خصوصی انعام ماہِ دسمبر میں کسی وقت بھجوا دیا جائے گا۔ کامیاب ہونے والے مصوّروں کو ادارہ آنکھ مچولی مبارکباد پیش کرتا ہے۔ اور ان کی تخلیقی صلاحیتوں میں اضافے کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعاگو ہیں۔

حفیظ احمد ساجد۔ مظفر گڑھ (اوّل)

محمد افضل سراج۔ گوجرانوالہ (دوم)

نام بھجوائیں انعام پائیں

فوزیہ فاضل - کریم آباد کراچی (خصوصی انعام)

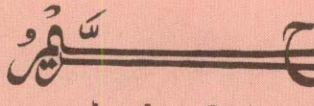

عمر نواز ماہر - بنوں سٹی

قادر نواز - بنوں سٹی۔

حفیظ احمد ساجد - مظفر گڑھ

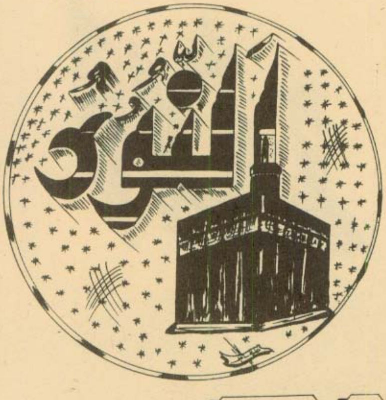

نامعلوم

سید محمد جنید عالم - فیڈرل بی ایریا۔ کراچی

طیّب جمیل قریشی - سیالکوٹ

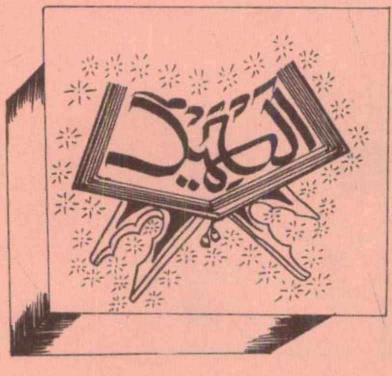

نصیر احمد جاوید
مظفر گڑھ

مرزا سلمان رضا بیگ ۔ مغل پورہ ۔ لاہور

زندگی سے پیار کیجئے

عمر نواز ماھر
بنوں

ابّو ایک بات کہوں ؟
ہاں کہو کیا بات ہے ۔
ابو آپ بُرا تو نہیں مانیں گے ؟
نہیں بیٹے ! کہو کیا بات ہے ۔
ابو ! آپ کو ہماری زندگی عزیز ہے ؟
جی ہاں بیٹا ! کیوں نہیں ۔
اور ابو آپ کو اپنی زندگی سے بھی پیار ہے ؟
جی ہاں ! زندگی سے کون پیار نہیں کرتا ۔
تو بس اس لئے ابو میں نے آپ کی سگریٹ کی ڈبیہ تکئے کے نیچے سے نکال کر جلا دی ہے اور سارے کے سارے سگریٹ جل گئے ۔ ابو آپ بُرا تو نہیں مانے ؟

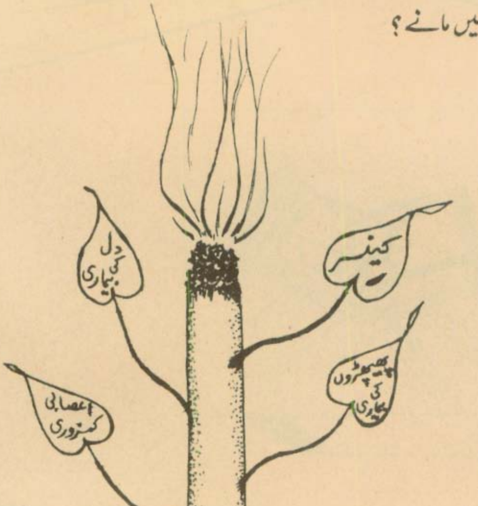

جب آپ
سگریٹ سُلگاتے ہیں
تو ایک کش میں
آپ کئی خطرناک
بیماریوں کا بیج بو رہے ہیں ۔
جو آگے جا کر
ایک تناور درخت بن جائے گا ۔
آیئے سب مل کر
اس درخت کو
کاٹ لیں

سگریٹ نوشی سے انکار کیجئے
زندگی سے پیار کیجئے

بنوں سے ہمارے ساتھی عمر نواز ماھر نے آنکھ مچولی کی "سگریٹ چھڑاؤ تحریک" سے متاثر ہو کر یہ خوبصورت آئٹم ہمیں بھجوایا ہے ۔ ہم اُن کی خوبصورت تخلیقی کاوش پر انہیں مبارک باد پیش کرتے ہیں ۔

انجانی مہم

علی رضا عابدی

قسط نمبر ۴

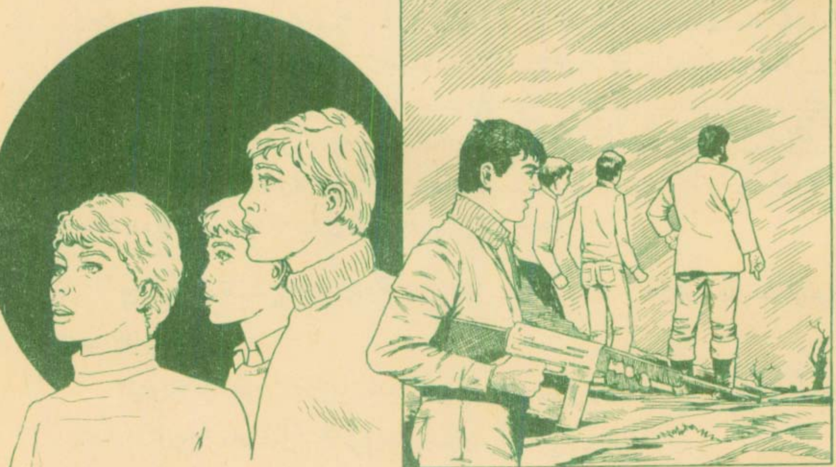

صفدر، منصور اور ذیشان آپس میں گہرے دوست ہیں۔ لاہور جانے کے لئے وہ کراچی اسٹیشن سے ٹرین پر سوار ہوئے دورانِ سفر ایک پُراسرار شخص جس نے نیلا کوٹ زیب تن کیا ہوا تھا۔ اُن سے باتیں کرنے لگا۔ دورانِ گفتگو منصور کے ہاتھ میں ذیشان نے ایک پرچی تھمائی جس پر کوڈ ورڈ کا ایک جملہ تحریر تھا۔ باتھ روم میں جا کر منصور نے پرچی دیکھی تو اس پر درج تھا کہ "ھو بڑ نا ثواگ ہوام یا" یعنی "یہ آدمی ٹھیک نہیں ہے" منصور ہاتھ دھو کر باتھ روم سے نکلا تو اُسے شدید حیرت ہوئی کیونکہ نیلے کوٹ والا غائب تھا لیکن اس کا کوٹ نشست پر موجود تھا۔ معلوم ہوا کہ وہ اپنا کوٹ چھوڑ کر سوٹ کیس لے کر روانہ ہو گیا۔ اچانک منصور نے اپنے سامان کو دیکھا تو پتا چلا کہ نیلے کوٹ والا اپنا سوٹ کیس چھوڑ کر ان کا سوٹ کیس لے گیا ہے۔ اتنے میں ٹرین کی رفتار بھی کم ہونے لگی۔ ٹرین تھوڑی دیر کے لئے اسٹیشن پر رُکی اور پھر چل پڑی۔ جس علاقے سے ٹرین گزُر رہی تھی یہ ملٹری کا علاقہ تھا۔ ذیشان نے اپنا شک ظاہر کیا کہ ممکن ہے نیلے کوٹ والا مشتبہ شخص چیکنگ کے خوف سے

یہ سوٹ کیس یہاں چھوڑ گیا ہو۔ ابھی وہ یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ پولیس انسپکٹر سامان کو شک بھری نظروں سے دیکھتا ہوا وہاں آپہنچا۔ پولیس انسپکٹر سوٹ کیس اور نیلے کوٹ کو دیکھ کر ٹھٹھکا۔ اور تلاشی لینا چاہی۔ مگر ذیشان نے انسپکٹر کو ایک کارڈ دیتے ہوئے بتایا کہ وہ کرنل رحمان کے پرائیویٹ سیکرٹ سروس کے رکن ہیں۔ اس پر انسپکٹر مطمئن ہو کر چلا گیا۔ رات کو جب اندھیرا چھا گیا تو کھانا کھانے کے بعد ذیشان منصور اور صفدر سوٹ کیس لے کر باتھ روم گئے اور اپنے پاس پہلے سے موجود ماسٹر چابی کے ذریعے اُسے کھولنے کی کوشش کی۔ سوٹ کیس میں سونے کی اینٹیں اور ہیرے جگمگا رہے تھے۔ انہوں نے طے کیا کہ وہ لاہور پہنچ کر خالو کی مدد سے اس سوٹ کیس کی بابت پولیس کو بتائیں گے۔ لاہور پہنچنے کے بعد جب وہ اسٹیشن سے باہر آئے تو ایک ٹیکسی اُن کے قریب آکر رُکی۔ ٹیکسی ڈرائیور نے کہا کہ میں آپ کو آپ کی منزل پر چھوڑ دوں گا۔ تشریف رکھیں۔ ذیشان، منصور اور صفدر ٹیکسی میں بیٹھ گئے، ٹیکسی چل دی۔ تھوڑی دیر بعد جب ٹیکسی شہر کو چھوڑ کر ویرانے کی طرف جانے لگی تو صفدر چلّایا... یہ کیا حرکت ہے؟ اس پر ڈرائیور نے اپنے چہرے پر سے سر کے ہوئے ہیٹ کو ہٹا کر انہیں دیکھا اور ان پر پستول تان لی... تینوں سہم گئے۔ یہ تو وہی شخص تھا نیلے کوٹ والا۔ ٹیکسی چلتی رہی۔ تھوڑی دیر بعد وہ ایک غیر آباد علاقے میں پہنچ چکے تھے۔ انہیں گھنی جھاڑیوں میں ہی ایک عمارت میں لے جایا گیا۔ اندر تاریک شیشوں کی عینک چڑھائے میگھاری نام کا ایک شخص انہیں ملا۔ یہ چیف باس کا نائب تھا۔ وہاں موجود غنڈے اور میگھاری ان تینوں کو کرنل رحمٰن کے حوالے سے اچھی طرح جانتا تھا۔ چنانچہ اس کے حکم سے تینوں کو ایک تنگ و تاریک کمرے میں بند کر دیا گیا۔ مگر ات کو وہ کسی نہ کسی طرح اس عمارت سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ جب وہ اپنے خالو کے گھر پہنچے تو وہاں سے تیز تیز بولنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ اندر سے آنے والی آوازیں میگھاری، دھاریوال اور ان کے خالو کی تھیں۔ دھاریوال کو اچانک ان کی موجودگی کا احساس ہو گیا۔ مگر وہ اس کے آنے سے پہلے ہی گھر سے باہر نکل آئے۔ انہوں نے سامنے جو دیکھا اس کی ان کو بالکل توقع نہ تھی۔ پھر اب آپ آگے بڑھیئے۔

چند گز کے فاصلے پر جمبو اور گیٹو ہاتھوں میں پستول لئے کھڑے تھے۔ اور ان تینوں کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

"اپنے ہاتھ اُوپر اُٹھا دو" جمبو غرایا "شاباش، اب تینوں دروازے کی طرف رُخ کرو اور چُپ چاپ آگے چلتے رہو اگر ذرا بھی چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو اس جگہ تم تینوں کی لاشیں تڑپتی ہوئی نظر آئیں گی:

"جو یہ کہہ رہے ہیں اس پر عمل کرو کیونکہ ہمارے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں" منصور نے پُرسکون لہجے میں کہا۔

تینوں پستول کی زد میں ایک بار پھر کوٹھی میں داخل ہوئے۔ ابھی وہ تینوں راہ داری کو عبور کر رہے تھے کہ اچانک سامنے سے دھاریوال اور میگھاری کا چہرہ نظر آیا۔ تینوں لڑکوں کو دیکھ کر دھاریوال اور میگھاری حیران رہ گئے لیکن پھر تیزی سے ان دونوں نے بھی پستول نکال لئے۔

"تم انہیں کس کے حکم سے لے کر آئے ہو" میگھاری نے چیختے ہوئے کہا۔

"انہیں ہم نہیں لائے ہیں باس!" گیٹو نے سٹ پٹا کر کہا۔

"یہ گدھے تمہیں کیا بتائیں گے ہم بتاتے ہیں" منصور نے زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "بات دراصل یہ تھی کہ تم ہمیں قید میں چھوڑ آئے تھے اور ہمارا دل تمہارے بغیر نہیں لگ رہا تھا اس لئے ہم تمہارے پاس خود چلے آئے"

"بکواس بند کرو" میگھاری زور سے چلّایا۔

"کیا بات ہے میگھاری؟" اندر سے ایک بھاری آواز سنائی دی۔ پھر جو چہرہ نمودار ہوا وہ صفدر کے خالو کا چہرہ تھا۔ "ارے صفدر تم" وہ چونک کر بولے۔ ان کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ تھوڑی دیر تک خاموش رہ کر وہ میگھاری سے مخاطب ہوئے "کیا یہ وہی تینوں قیدی ہیں؟"

"یس باس! میں آپ کو اطلاع دینے آیا تھا۔ اور اس دوران یہ ہمارے آدمیوں کو دھوکہ دے کر فرار ہوگئے۔ میرے دونوں آدمی ان تینوں کا تعاقب کرتے ہوئے یہاں پہنچے ہیں۔ اور اتفاق ہے کہ انہیں پھر پکڑنے میں کامیاب ہوگئے" میگھاری اس طرح بول رہا تھا جیسے ٹیپ ریکارڈر آن ہوگیا ہو۔

"اوہ!" وہ ایک لمبی سانس لے کر بولے "انہیں اندر لے آؤ"

تینوں لڑکوں کو دھکیلتے ہوئے کمرے میں لایا گیا۔ صفدر ابھی تک اسی فکر میں تھا کہ خالو کا ان بدمعاشوں سے کیا تعلق ہوسکتا ہے۔ کیونکہ وہ تو شہر کے معزز تاجر تھے اور سارا شہر انہیں حاجی کمال بیگ کے نام سے جانتا تھا۔ ان کے کئی سینما گھر تھے اور ملک کے بااثر سیاستدانوں سے ان کے مراسم تھے۔ بلکہ مختلف قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے ممبران کا تو ان کے گھر اتنا زیادہ آنا جانا تھا کہ وہ اُن کے گھر کے فرد ہی معلوم ہوتے تھے۔ حاجی کمال بیگ کی آنکھیں گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں اور چہرے پر اُلجھن کے آثار تھے جیسے وہ کسی فیصلے پر پہنچنا چاہ رہا ہو "خالو جان!" صفدر نے مخاطب کیا "یہ سب کچھ کیا ہے؟"

"تم نے آگ میں ہاتھ ڈال دیا ہے صفدر" حاجی کمال بیگ بولا "اب تمہارا ہاتھ بھی جلے گا" وہ رُکا پھر اُس نے میگھاری کو حکم دیا۔

"ان تینوں کو قید کردو" اور خود تیزی سے دوسرے کمرے میں داخل ہوگیا۔ اور کمرے کی دیوار کے ساتھ رکھی ہوئی الماری کھول کر ایک درازے سے ایک چھوٹا ٹرانسمیٹر نکالا جو بظاہر ریڈیو نظر آتا تھا۔ سوئچ آن کرکے اُس نے کہا "ہیلو۔ بیگ! اسپیکنگ"

"ہیلو ہاکسن ولیم اسپیکنگ" دوسری طرف سے ایک گونج دار آواز سُنائی دی۔

"کیا بات ہے بیگ بہت گھبرائے ہوئے ہو"

"باس آپ تو کرنل رحمان سے بخوبی واقف ہوں گے"

"ہاں وہ بوڑھا جاسوس، وہ شخص جو بہت دنوں سے ہمارے پیچھے سائے کی طرح لگا ہُوا ہے۔"

"ہاں باس وہی! اور اُس کے محکمے سے تعلق رکھنے والے تینوں لڑکے ٹرین سے میگھاری کا تعاقب کر رہے تھے اس وقت ہماری قید میں ہیں۔" کمال بیگ نے تفصیل سے سارا واقعہ سُنا دیا۔

"اس وقت وہ کہاں ہیں؟" دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

"باس میری کوٹھی کے تہہ خانے میں۔"

"احمق کہیں کے۔" باس کی دھاڑ سنائی دی۔ "پتا نہیں تم کیا جھک مار رہے ہو۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ تمہیں کتنی احتیاط کرنی چاہیے۔ کرنل رحمان سے تعلق رکھنے والے تین آدمی تعاقب کرتے ہوئے تمہاری کوٹھی تک پہنچ گئے۔ اور تم نے اُنہیں کوٹھی میں قید کر رکھا ہے۔ تمہیں معلوم نہیں کہ کرنل رحمان کتنا خطرناک بڈھا ہے۔"

"آپ کا کیا حکم ہے باس۔" کمال بیگ نے بوکھلا کر پوچھا۔

"ان تینوں کو ہوشیاری کے ساتھ ہیڈ کوارٹر منتقل کر دو۔"

"باس ایک مسئلہ آپڑا تھا۔" آواز آئی۔

"اب کیا نیا مسئلہ آپڑا؟"

"باس! ان تینوں میں صفدر نام کا ایک لڑکا میرا عزیز ہے۔" خاور نے ہکلاتے ہوئے کہا

"تمہیں کیا ہو گیا ہے بیگ۔ اس پیشے میں محبت صرف پیشے سے ہونی چاہیے۔ اس کے علاوہ کوئی رشتہ اہم نہیں ہوتا۔" باس نے خونخوار لہجے میں کہا۔

"اوکے باس!" کمال بیگ نے تھکے ہوئے انداز میں کہا۔

تینوں لڑکے ایک بند کار میں سفر کر رہے تھے۔ اگلی نشست پر جمبو اور گیٹو بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں پستول تھے۔ جن کا رُخ ان تینوں کی طرف تھا۔ میگھاری کار ڈرائیو کر رہا تھا۔ کار کسی انجان راستے پر تیزی سے دوڑ رہی تھی۔ صفدر اپنی سیٹ پر بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا۔ اس کی پریشانی کی وجہ اس کے خالو کی شخصیت تھی جو انتہائی خطرناک روپ میں اُس کے سامنے آئی تھی۔ ذیشان بھی کچھ کھویا کھویا نظر آرہا تھا۔ لیکن منصور کا چہرہ پُرسکون تھا۔ دفعتاً وہ صفدر کو دیکھ کر شرارت سے مسکرایا۔ اور بولا: "واہ صفدر! تمہارے خالو تو بڑے صاحبِ کرامات نکلے۔ صفدر نے منصور کی طرف دیکھا اور لب ہلا کر رہ گیا۔

"تم صفدر کو مزید پریشان کر رہے ہو۔" ذیشان نے جھلا کر کہا: "اس میں پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں" منصور نے پُرسکون لہجے میں جواب دیا۔ "انسان اپنی آگ میں خود جلتا ہے۔ اور ہر آدمی اپنے کردار کا مالک ہوتا ہے۔ لہٰذا تمہیں شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔" منصور نے صفدر کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

"دورانِ سفر آپ حضرات کو گفتگو کرنے کی اجازت نہیں"
خلافِ توقع میگھاری بڑے شائستہ لہجے میں ان سے مخاطب ہُوا۔
"اور اگر ہم خاموش نہ رہیں تو؟" صفدر بپھر کر بولا۔
"تو پھر مجبوراً آپ حضرات کو خاموش رکھنے کے لئے میرے دونوں آدمی اپنے پستول کو حرکت دینے پر مجبور ہو جائیں گے" میگھاری کے لبوں پر وہی زہریلی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ جسے وہ ایک بار ٹیکسی ڈرائیور کے روپ میں دیکھ چکے تھے۔ باقی راستہ خاموشی سے طے ہوتا رہا۔
گاڑی اب ناہموار راستے پر ہچکولے کھاتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ تقریباً چار گھنٹے کی مسافت کے بعد گاڑی ایک جھٹکے سے رُکی اور وہ تینوں بدمعاش کار کا دروازہ کھول کر نیچے اُتر گئے۔ اور ان تینوں کو بھی ریوالور کے اشارے سے نیچے اُترنے کا حکم دیا۔ جب تینوں نیچے اُترے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ وہ شہری آبادی سے کوسوں دُور ایک پہاڑی علاقے میں کھڑے ہوئے تھے۔ دُور دُور تک اونچی نیچی پہاڑیوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ ڈرائیور بھی گاڑی سے نیچے اُتر آیا تھا۔ اور اُس کے ہاتھ میں ریوالور کی جگہ اسٹین گن تھی۔ میگھاری بھی اپنے ساتھیوں کو اشارہ کرتے ہوئے ان کے پیچھے چلنے لگا۔ تینوں خاموشی سے ہاتھ اُٹھائے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ درّہ کے ختم ہونے پر ایک چڑھائی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ دفعتاً منصور لڑکھڑایا اور منہ کے بل زمین پر گرا۔ منصور نے گرتے ہوئے اپنے دونوں پیر اپنے پیچھے آنے والے دھاریوال کے ٹخنوں پر مارے دھاریوال کے پیر کے نیچے سے پتھر کھسکے اور وہ بھی اوندھے منہ زمین پر گرا۔ اس کا سَر ایک چٹان سے ٹکرا گیا اور اسٹین گن ہاتھ سے چھوٹ گئی اور خود دھاریوال نشیب میں گرتا چلا گیا۔ منصور نے جھپٹ کر اسٹین گن اُٹھالی۔ یہ سب کچھ پلک جھپکتے میں ہوا۔ جمبو اور گیٹو جو دھاریوال کے ساتھ چل رہے تھے۔ موقع کی نزاکت کو سمجھنے بھی نہ پائے تھے کہ منصور نے اسٹین گن کا رُخ دونوں کی طرف کر کے ریوالور پھینکنے کا حکم دیا۔ صفدر نے جھپٹ کر میگھاری کو دبوچ لیا۔
"ان تینوں کی جیبوں کی تلاشی لو" منصور نے ذیشان سے کہا۔ ذیشان نے جب میگھاری کی تلاشی لی تو اس کی جیب سے ایک پستول برآمد ہُوا۔ صفدر نے میگھاری کو ان دونوں کی طرف دھکیل دیا۔ اور خود بھی تلاشی لینے میں مصروف ہو گیا۔ ان کی جیبوں سے ایک چاقو اور ایک ریشم کی ڈوری کا لچھا برآمد ہوا۔
"زمین پر پڑے ہوئے ریوالور کو اُٹھا لو" منصور نے ذیشان سے کہا۔ "اور صفدر تم اس ریشم کی ڈوری سے ان تینوں کے ہاتھ پُشت پر باندھ دو"
باری باری تینوں کے ہاتھ باندھ دیئے گئے۔ اور پھر انہیں دھکیلتے ہوئے وہ ایک غار کی طرف بڑھنے لگے۔
غار میں پہنچ کر منصور ان لوگوں سے مخاطب ہوا "ہاں تو دوستو! اب سب کچھ صاف صاف بتا دو۔ تم کس کے لئے

کام کرتے ہو؟"

"تمہیں پچھتانا پڑے گا" میگھاری غرّایا۔

"ہم تو بعد میں پچھتالیں گے لیکن دوستو اگر تم نے ہمارے سوالوں کے جواب نہیں دیئے تو تمہیں پچھتانے کا موقع بھی نہ ملے گا" منصور نے مُسکراتے ہوئے کہا "تم اور حاجی کمال بیگ کس کے لئے کام کرتے ہو؟"

"ہم کچھ نہیں جانتے" تینوں بیک وقت چلّا کر بولے۔

منصور نے صفدر اور ذیشان کی طرف اشارہ کیا اور دونوں خاموشی سے آگے بڑھے اور ان تینوں پر ٹوٹ پڑے تینوں کے ہاتھ پُشت پر بندھے ہوئے تھے۔ اس لئے پٹنے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔ صفدر ایک ایک کے بال پکڑ کر چہرے پر مکّے مارتا اور کہتا جاتا۔

"ہاں میرے خالو کے دوستو اپنے ہیڈکوارٹر کا پتا بتاؤ" یہاں تک کہ وہ تینوں چیخنے پر مجبور ہو گئے۔

"بتاتے ہیں" میگھاری نے ہانپتے ہوئے کہا۔

"یہاں سے شمال کی جانب تین کلومیٹر کے فاصلے پر پہاڑیوں کے درمیان تم کو ایک عمارت نظر آئے گی، بس وہی ہمارا ہیڈکوارٹر ہے"

"اپنے باس کا نام اور حُلیہ بتاؤ؟"

"ہمارے باس کا نام ہاکن ولیم ہے، طویل قامت آدمی ہے مگر ہم نے اُس کا چہرہ آج تک نہیں دیکھا۔ ہم صرف چار مرتبہ اس عمارت میں گئے ہیں وہ بھی باس کے کہنے پر لیکن باس کا چہرہ نہیں دیکھ سکے۔ کیونکہ اس کے چہرے پر دبیز نقاب ہوتی ہے" میگھاری نے جلدی جلدی بولنا شروع کر دیا۔

"خیر ٹھیک ہے" منصور نے کہا "اگر اب تم اپنی لاشوں کو اس غار میں سڑنے سے بچانا چاہتے ہو تو جو ہم کہہ رہے ہیں اُس پر خاموشی سے عمل کرتے رہو اور ہمیں اپنی رہنمائی میں اپنے ہیڈکوارٹر تک پہنچادو"۔

وہ تینوں چاروناچار اس بات پر راضی ہو گئے۔

اور ایک بار پھر پیدل سفر کا آغاز ہو گیا۔ میگھاری سب سے آگے تھا اور اُس کے دونوں ساتھی منصور، ذیشان اور صفدر کے غول میں چل رہے تھے۔

"اپنے ہاتھ اُوپر اُٹھادو" دفعتاً بائیں جانب سے ایک آواز پہاڑوں میں گونجی۔

(آگے کیا ھوا؟ اس کی تفصیل اگلی قسط میں ھمیں لکھ بھیجئے)

انجانی مہم کی چوتھی قسط کے لئے جن قلمکاروں نے ہمیں اپنی نگارشات ارسال کیں۔ اُن کے نام یہ ہیں۔

(۱) عامر نذیر شہزاد ۔ پاپوش نگر، کراچی (۲) سید مشیر الحسن ۔ گزدر آباد ۔ کراچی

(۳) محمد فاروق حمید خان ۔ لیاقت آباد ۔ کراچی
(۴) صائمہ کنول ، حیدر آباد
(۵) عظمیٰ کنول ۔ حیدر آباد
(۶) نجمہ ناز ، حیدر آباد
(۷) عبداللہ شیخ ۔ حیدر آباد
(۸) عظمیٰ عقیل فاروقی ۔ سکھر
(۹) صلاح الدین عباسی ۔ سکھر
(۱۰) علی حسن لغاری ۔ ماتلی
(۱۱) محمد جاوید اقبال سہتہ رانی پور
(۱۲) دُرِ ثمین سیمی ۔ نیو سمن آباد ۔ لاہور
(۱۳) خورشید احمد کمال ہری پور ہزارہ
(۱۴) لبنیٰ ارشاد قریشی ڈیرہ اسماعیل خان

مقررہ تاریخ گزرنے کے بعد ملنے والی کہانیوں کے مصنفوں کے نام

(۱) عابد وسیم ۔ ؟ (۲) محمد بن مالک ۔ دستگیر کراچی (۳) اطہر رضا ۔ لالوکھیت ۔ کراچی
(۴) جمیلہ عزیز ۔ ٹنڈو محمد خان (۵) ذکاء الدین ۔ ماڈل ٹاؤن ، لاہور (۶) اسد نواز خان ۔ ؟

ایسی جلدی بھی کیا ہے

کھانا کھاتے ہوئے بے صبری کا مظاہرہ کبھی نہ کیجئے

بھی ہوسکتا ہے ۔ عجلت میں کھایا ہوا کھانا پیٹ کی تکالیف
اور نظام ہضم میں خرابی کا باعث بن سکتا ہے ۔

تحمل کے ساتھ
کھانے کی عادت
آپ کی صحت
کی ضامن ہے ۔

(اشتہار ادارہ آنکھ مچولی)

ایک بکری کی سرگزشت

محمد جاوید خالد

چراگاہ میں ایک بکری تھی چرتی — کہ آواز اُس کو کچھ آئی اُبھرتی
نظر جو اُٹھائی تو دیکھا کہ کُتّے — شکاری کو لے کر چلے آ رہے تھے
کہاں کی چراگاہ؟ پھر کیسا چارا — فقط چاہئے تھا اُسے اِک سہارا
پناہ گاہ ایسی جو اُس کو چھُپا لے — کہ اب پڑ گئے تھے اُسے جاں کے لالے
گھنا پیڑ اک پاس ہی اُس نے پایا — تو جلدی سے خود کو وہیں جا چھُپایا
شکاری نے کتّوں نے کوشش بہت کی — نظر اُن کو لیکن نہیں آئی بکری
بہت سخت آیا تھا بکری پہ وہ دن — اُڑا دی تھی دہشت نے سب بھُوک لیکن
جو کچھ دیر گزری، ہُوا خوف رُخصت — تو کھانے کو مچلی پھر اُس کی طبیعت
رہا صبر کا جب نہ کچھ اُس کو یارا — تو پتّوں پہ اس پیڑ کے منہ کو مارا
وہی پیڑ جس نے چھُپایا تھا اُس کو — شکاری کی زد سے بچایا تھا اُس کو
نہ کم بخت بکری نے سوچا ذرا بھی — کہ پتّوں نے روکی ہوئی تھی قضا بھی
نہ دیکھا تھا بکری کو کُتّوں نے اب تک — چھُپی رہتی لیکن بنا پتّوں کب تک؟
شکاری نے یک دم جو دیکھا پلٹ کر — وہیں کُتّے لپکے، بڑھے وہ جھپٹ کر
لپکنے، جھپٹنے کی بس اِک گھڑی تھی — ذرا دیر میں بکری مُردہ پڑی تھی
جو کرتے ہیں ختم اپنا خود ہی ٹھکانہ — بناتی ہے اُن کو اجل پھر نشانہ

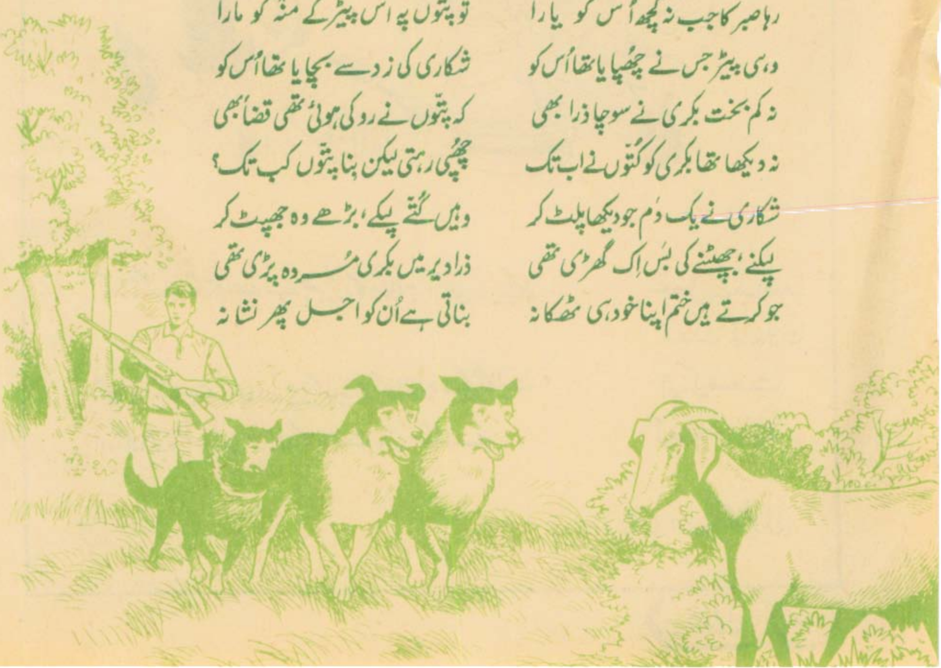

پھنڈال چوکڑی

آپ اسے پھنڈال چوکڑی
نہیں تو پھر اور کیا کہیں گے ؟

ایم شہزاد احمد

جمعہ والے دن امّی اور ابّو انکل کے گھر چلے گئے ۔ جاتے وقت امّی نے ہمیں چند ہدایتیں دیں وہ یہ تھیں۔

۱ ۔ شرارتیں نہ کی جائیں ۔
۲ ۔ ایک دوسرے کو تنگ نہ کیا جائے ۔
۳ ۔ سب لوگ گھر میں رہیں باہر نہ جائیں ۔
۴ ۔ کھانا فریج میں رکھا ہوا ہے وہ گرم کرکے دوپہر کے وقت کھایا جائے ۔

ہم نے گھونسلے میں جاکر یہ حکمنامہ سنایا (گھونسلے کے نام پر آپ چونک گئے ہوں گے ۔ ہم ابھی آپ کو گھونسلے کی تفصیل بتاتے ہیں ۔) ہیرو صاحب مٹک کر بولے ہم تو کھانا پکائیں گے ۔عمران خان گیند اور بیٹ لے کر پریکٹس کرنے چلے گئے ۔ پرنس نے ہمیں آرڈر دیا کہ ہم لان میں جا رہے ہیں ۔ ہمارے لئے ایک گلاس دودھ اور آنکھ مچولی لان میں لے آؤ ۔ آپ کو پھر حیرانگی ہوگی کہ یہ کیا قصہ ہے ۔ آئیے ہم آپ کو بتائیں۔

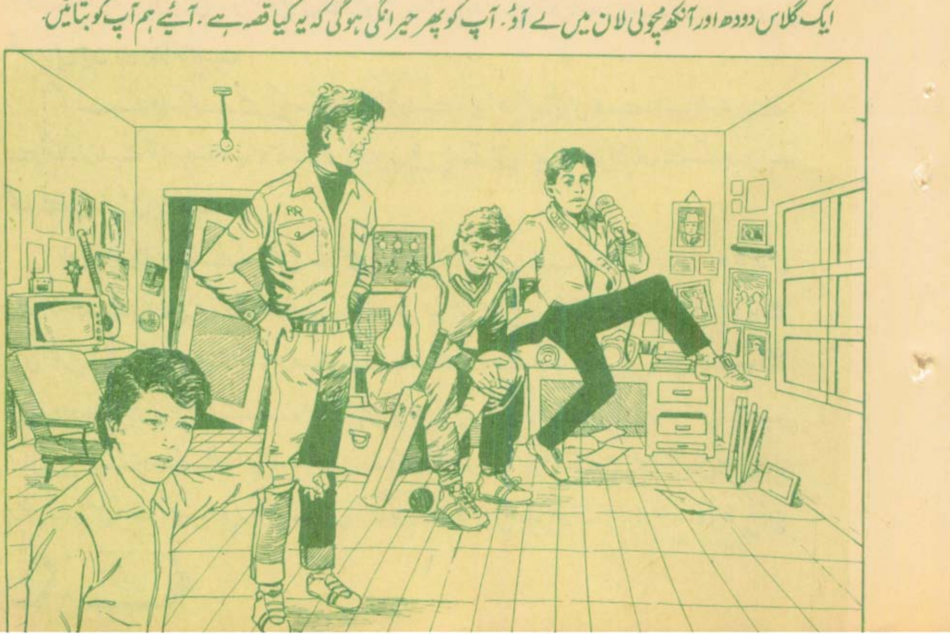

ہم اوپر تلے کے چار بھائی ہیں ہم سب میں اتفاق بھی بہت ہے اور لڑائی جھگڑا بھی بہت ہوتا ہے۔ ہمارے گھر میں وہ اودھم مچتا ہے کہ شیطان بھی دیکھے تو ہمیں اپنا اُستاد تسلیم کرے۔ آیئے پہلے ہم تعارف کروادیں۔ یہ ہیں فرحان صاحب، موصوف نہایت حسین اور وجیہہ واقع ہوئے ہیں اور انہیں اپنی خوبصورتی پر بڑا فخر ہے، پرنس کہلوانے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ یہ ہمارے سب سے بڑے بھائی ہیں۔ اور یہ ہیں فیضان صاحب۔ انھیں کرکٹ سے بہت زیادہ لگاؤ ہے۔ موصوف بولنگ کرتے ہیں۔ اور عمران خان ان کے پسندیدہ کھلاڑی ہیں۔ فیضان بھائی خود کو عمران خان کہلوا کر خوشی محسوس کرتے ہیں اور جہاں تک سوال ہے فہد کا تو بھئی انھیں اداکار بننے کا بہت شوق ہے۔ جب موڈ میں ہوں تو فلمی اداکاروں کے انداز میں ڈائیلاگ بولتے ہیں۔ اس لئے ہم نے ان کا نام ہیرو رکھ چھوڑا ہے اور بدقسمتی سے سب سے چھوٹے ہم خود ہیں۔ اس لئے ہمارے بھائی ہم پر حکم چلاتے رہتے ہیں۔ اب ایک جائزہ ہمارے گھونسلے یعنی کمرے کا۔

یہ ایک ہال نما کمرہ ہے۔ کمرے میں اسپتال کی طرز پر چار بستر لگے ہوئے ہیں۔ مشرقی دیوار پہ عمران خان کے لاتعداد پوسٹرز لگے ہوئے ہیں۔ آپ سمجھ چکے ہوں گے کہ یہ فیضان کا کام ہے۔ مغربی دیوار پر فلمی اداکاروں کی تصویریں لگی ہوئی ہیں۔ یہ فہد کا کارنامہ ہے۔ شمالی دیوار پرنس کی ملکیت ہے۔ انھوں نے کسی اداکار، نہیں۔ کسی کھلاڑی، اُوں ہوں۔ کھلاڑی بھلا کب ان کی نظروں میں جچتے ہیں۔ انھوں نے دیوار پر اپنی بڑی بڑی تصویریں لگا رکھی ہیں۔ جنوبی دیوار پر نشانِ حیدر پانے والے شہیدوں کی تصویریں ہیں۔ یہ ہمارا کام ہے

کمرے کے ایک کونے میں ایک ڈھانچہ پڑا ہُوا ہے۔ یہ ڈھانچہ ٹی وی کا ہے۔ جب ٹی وی چلنے سے انکار کرتا ہے تو ہیرو صاحب جوتا لے کر ٹی وی پر پل پڑتے ہیں۔ چھ سات ہتر کھانے کے بعد کھانستے کھانستے ٹی وی چل پڑتا ہے۔

ہاں تو ہم بتا رہے تھے کہ پرنس نے ہمیں آرڈر دیا کہ لان میں ہمارے لئے رسالہ اور دودھ کا گلاس لے آؤ۔ ہم نے پہلے پرنس کو "آنکھ مچولی" رسالہ دیا۔ پھر ہم کچن میں پہنچے تو ہیرو صاحب ایپرن باندھے کسی انگریزی فلم کی بوڑھی لینڈ لیڈی دکھائی دے رہے تھے۔ ہم نے ایک گلاس میں ڈھیر سارا نمک ڈالا اور پھر دودھ ڈال کر پرنس کو دے آئے اور خود کچن کی کھڑکی میں بیٹھ کر دیکھنے لگے۔ پرنس کسی دلچسپ کہانی میں کھوئے ہوئے تھے۔ اچانک انھوں نے دُودھ کا گھونٹ بھرا اتنے میں عمران خان جلدی جلدی پرنس کے پاس آئے۔ جب وہ پرنس کے پاس سے گزرے تو پرنس نے گھونٹ بھرا جو فوارے کی طرح اُن

کے منہ سے نکل کر عمران خان کے صاف ستھرے کرکٹ ڈریس پہ جا پڑا۔ بس پھر کیا تھا عمران کو جوش آگیا۔ انھوں نے بیٹ سے پرنس کی خاطر شروع کر دی۔ ہم نے جو کچن کی کھڑکی میں بیٹھے ہوئے تھے۔ بے خیالی میں چھلانگ لگائی۔ اور میدانِ جنگ میں کود گئے۔ ہیرو صاحب نے کھڑکی سے یہ دنگل دیکھا تو وہ دوڑے دوڑے آئے اُن کا ایپرن کافی لمبا تھا۔ جس سے وہ دوبارہ گرتے گرتے بچے۔ انھوں نے ہاتھ میں فرائنگ پین پکڑا ہوا تھا۔ جس میں وہ انڈا فرائی کر رہے تھے۔ انھوں نے انڈے سمیت فرائنگ پین سے ہم تینوں کو مارنا شروع کر دیا۔ اچانک عمران خان نے زور سے بیٹ پرنس کو مارا مگر ان کا نشانہ خطا گیا۔ اور بیٹ سیدھا ہیرو کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے فرائنگ پین پر پڑا۔ اور فرائنگ پین کی دستی ٹوٹ گئی۔ پرنس کی حالت دیکھنے کے قابل تھی۔ اُن کا آسمانی رنگ کا سوٹ کالا ہو چکا تھا۔ عمران خان کے غصّے کا کوئی عالم نہ تھا۔ وہ سرکس کے شیر کی طرح دھاڑتے ہوئے باتھ روم میں چلے گئے۔ ہیرو فرائنگ پین جوڑنے کی تدبیریں کرنے لگے۔ سب سے بُرا حال ہمارا تھا۔ مار بھی ہمیں زیادہ پڑی تھی۔ جب تینوں "برے" حلیے ٹھیک کر کے آئے تو ہم ویسے ہی زمین پر پڑے تھے۔ اب ان سب کو تشویش ہوئی۔ عمران خان نے آگے بڑھ کر ہمیں اُٹھایا۔ اور اندر لے گئے۔ گھبراہٹ میں انھوں نے ہمیں پرنس کے بستر پر پٹخ دیا۔ ہیرو اور پرنس ڈاکٹر کو فون کرنے کے لئے بھاگے۔ عمران خان ہمارے لئے پانی لینے چلے گئے۔ ہم نے تکئے کے نیچے ہاتھ مارا۔ جو بلی چاکلیٹ پڑے ہوئے تھے۔ ہم نے چاکلیٹ جلدی سے اپنی جیکٹ کی جیب میں ٹھونس لئے اور آنکھیں موند کر پڑ رہے۔ ہیرو نے ہمارے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے۔ ہم نے آہستہ سے آنکھیں کھولیں۔ تینوں کے تشویش بھرے چہرے دیکھ کر ہم دل میں بہت خوش ہوئے پرنس آہستہ سے بولے ڈاکٹر کا نمبر نہیں مل رہا۔ اتنے میں ڈور بیل بجی۔ عمران دیکھنے کے لئے باہر بھاگے۔ جب وہ واپس آئے تو اُن کے ساتھ خالہ باتونی بھی تھیں۔ (موصوفہ نہایت عقلمند واقع ہوئی ہیں اور ہر معاملے میں ٹانگ اڑانا اپنا فرض سمجھتی ہیں۔) انھوں نے اندر آتے ہی حالات کا جائزہ لیا اور ہمارا علاج شروع کر دیا۔ سب سے پہلے انھوں نے ایک گلاس گرم دودھ ہمیں پلایا۔ اس کے بعد انھوں نے ریت منگوائی۔ اُسے گرم کر کے ایک پوٹلی میں باندھا اور ہماری چوٹوں کی سنکائی شروع کر دی۔ وہ ریت کی پوٹلی ہماری چوٹوں پر رکھتیں اور جب ہماری چیخ نکلتی اُس وقت اُٹھاتیں۔ جب ہمارا حال بُرا ہوا تب انھوں نے ہماری جان چھوڑی۔ جاتے جاتے وہ پرنس عمران اور ہیرو کو ہمارے متعلق نصیحتیں کر کے گئیں۔ ان کی نصیحتوں پر عمل کر کے اُن تینوں نے ہمارا جو حال کیا وہ ایک الگ داستان ہے۔ جو ہم کسی اور وقت سنائیں گے۔ پہلے ہماری چوٹوں کی تکلیف تو کم ہو جائے۔

مصوّری کا پہلا سبق :- اگر آپ کو مصوّری کا شوق ہے تو اس کی ابتدا ڈرائنگ کی ہلکی پھلکی مشقوں سے کیجئے۔ ابتدائی مشق کے طور سے نیچے دیئے ہوئے، ہاتھی اور گینڈے کے نامکمل حصوں کو مکمل کیجئے۔ بعد میں خالی خانوں میں ان دونوں جانوروں کی تصاویر بغیر کسی مدد کے بنائیے اور دیکھئے کہ آپ کی تصویر اور پہلے سے موجود تصویر میں کون سی بہتر ہے۔ مشق کے لئے صرف پنسل استعمال کیجئے

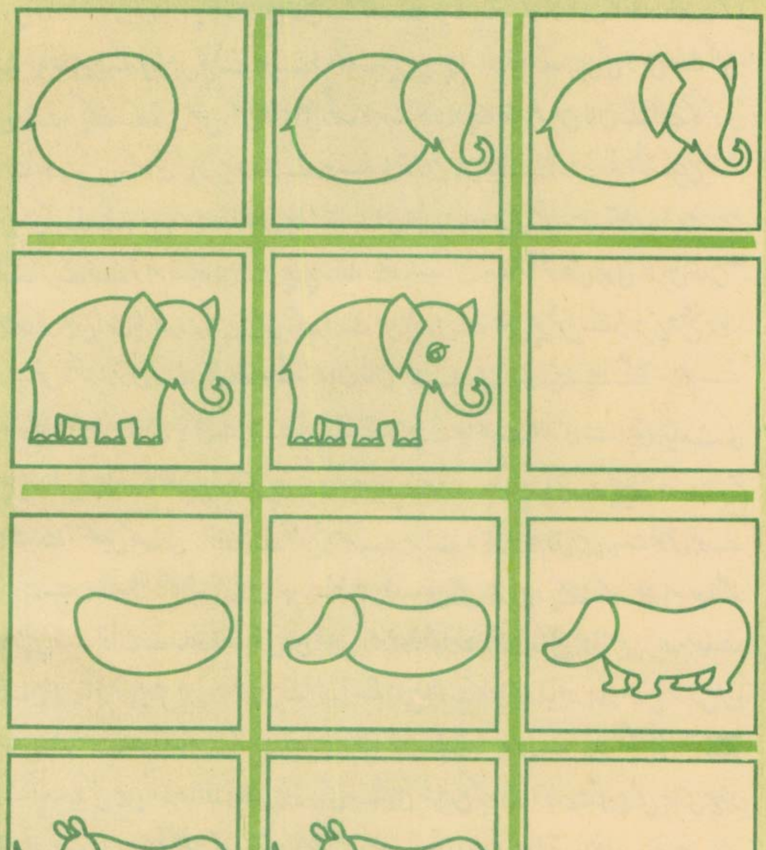

دیوارِ برلن سے آخری فرار

دو جیالے بھائیوں کا قصّہ
جنھوں نے کمیونسٹوں کے
حفاظتی جال
کو توڑ ڈالا

ابنِ عالم

ہنگو کا طیارہ مغربی برلن کے میدان میں پرواز کے لئے دوڑ رہا ہے

(دائیں سے بائیں) انگو اور ہولنگا نے کندھے پر ایگبرٹ کو اُٹھایا ہُوا ہے۔

آج کل آپ ٹیلی وژن پر مشرقی جرمنی سے مغربی جرمنی جانے والے ہزار ہا باشندوں کو دیکھ رہے ہوں گے۔ اِن باشندوں کے دمکتے چہرے اس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ اس آزادی کے ملنے پر وہ کتنے مسرور ہیں۔ پہلے تو کوئی مشرقی جرمنی سے کسی دوسرے ملک تو کیا خود مغربی جرمنی جانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ دونوں ممالک کے درمیان ایک بڑی دیوار، جی ہاں سچ مچ کی دیوار حائل تھی۔ جسے "دیوارِ برلن" کہا جاتا تھا۔ جو کوئی اس دیوار کو عبور کرنے کی کوشش کرتا وہ بے رحم سرحدی محافظین کی گولیوں کا نشانہ بن جاتا تھا البتہ ایسے کچھ لوگ کسی نہ کسی طرح اس دیوار کو عبور

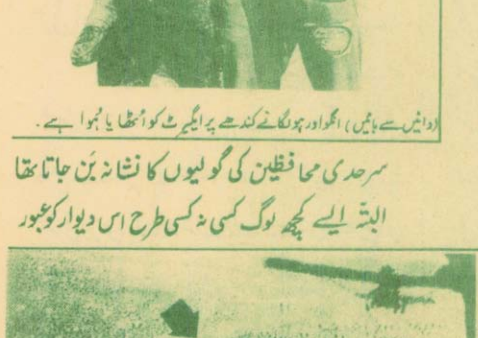

تیر کا نشان دیوارِ برلن کو ظاہر کر رہا ہے۔ یہ تصویر ہولنگا کے طیارے میں نصب کیمرے سے اتاری گئی ہے

کر کے مغربی جرمنی میں پہنچنے میں کامیاب بھی ہوئے مگر ان کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر تھی۔ دونوں ملکوں کی سرحدیں کھلنے سے چند ماہ پہلے مشرقی جرمنی کے دو بھائیوں نے جو فرار ہو کر مغربی جرمنی آ گئے تھے اپنے بھائی کو چھڑانے کے لئے ایک بار پھر مشرقی جرمنی کا رُخ کیا۔ وہ اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر آئے اور فتح مند ہو کر لوٹے۔ اس اعتبار سے یہ ان کا "آخری فرار" تھا۔

اصل کہانی سُنانے سے پہلے ہم آپ کو ان دونوں ممالک اور دیوارِ برلن کے متعلق مختصر معلومات سے آگاہ کر دیں تاکہ آپ کہانی کے پس منظر سے آگاہ رہ سکیں۔

مغربی جرمنی کا رقبہ چھیانوے ہزار چورانوے (96094) مربع میل ہے۔ یہ مغربی یورپ کا ایک ترقی یافتہ ملک ہے۔ اس کا دارالحکومت بون ہے۔

مشرقی جرمنی کا رقبہ اکتالیس ہزار سات سو اڑسٹھ (41768) مربع میل ہے۔ یہ مشرقی یورپ میں واقع ہے۔ اس کے دارالحکومت کا نام مشرقی برلن ہے مشرقی جرمنی ایک کیمونسٹ ملک ہے۔ اس لئے یہاں کے باشندوں کی زندگی میں خوف، گھٹن اور مایوسی کے عناصر شامل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مغربی جرمنی کا کوئی باشندہ مشرقی جرمنی جانے کا تصور بھی نہیں کرتا۔ جب کہ مشرقی جرمنی کے ہزاروں باشندے مغربی جرمنی جانے کی کوشش میں اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔ جبکہ بہت سے باشندے بچ نکلنے میں کامیاب بھی ہو گئے

چنانچہ ان افراد کو مغربی جرمنی جانے سے روکنے کے لئے دیوارِ برلن تعمیر کرنے کا فیصلہ مشرقی جرمنی کی اسمبلی نے ۱۲، اگست ۱۹۶۱ء کو کیا۔ چنانچہ دونوں ملکوں کی سرحد پر اُسی رات خار دار تاروں کی باڑھ لگانے کا کام شروع ہو گیا۔ بعد میں کنکریٹ کی چھ فٹ بلند دیوار تعمیر کر دی گئی۔ اس دیوار پر بھی خار دار تاریں لگی ہوئی ہیں اور مسلح محافظ ہر وقت یہاں اپنے فرائض انجام دیتے رہتے ہیں۔ دیوارِ برلن کی لمبائی ۲۸، میل ہے۔

کئی سال قبل مشرقی جرمنی کے دو بھائی ۳۵، سالہ انگو بیتھکا اور ۳۰، سالہ ہولگا بیتھکا فرار ہو کر مغربی جرمنی آ گئے تھے۔ مگر ان کا ایک اور بھائی ایگبرٹ مشرقی جرمنی ہی میں رہ گیا تھا۔ دونوں بھائیوں نے سوچا کہ کسی طرح اپنے بھائی کو بھی کیمونزم کے عذاب سے بچا کر لے آئیں۔ مگر یہ کام اتنا آسان نہ تھا۔ اس میں زندہ بچ رہنے کی اُمید تو بالکل نہ تھی۔ مگر آزادی بڑی نعمت ہے اور اس نعمت کے لئے بڑی سے بڑی قربانی دی جا سکتی ہے۔

دونوں بھائیوں نے مہینوں اس مہم کے لئے منصوبہ بندی کی۔ اس کے لئے خطیر سرمائے کی بھی ضرورت تھی چنانچہ انہوں نے ایک ہوٹل کھول لیا۔ تاکہ اس کی آمدنی سے معقول سرمایہ جمع کیا جا سکے۔ چنانچہ کئی برسوں کی محنت کے بعد انہوں نے اپنا ہوٹل ۳۰، ہزار ڈالر میں فروخت کر دیا۔ اس رقم سے انہوں نے دو چھوٹے ہوائی جہاز خریدے اور ایک ٹرک کرائے پر حاصل کیا۔ انھوں نے دونوں طیاروں کے پُرزوں کو الگ الگ کر کے ٹرک میں

چھپایا اور مغربی برلن کی طرف روانہ ہوگئے۔ ۲۹۱ میل کا طویل سفر طے کرکے وہ ایک بے انتہا وسیع میدان میں پہنچ گئے۔ جہاں سے اُن کے اصل سفر کا آغاز ہونا تھا۔ ایک ایسا سفر جس میں موت بھی ان کا استقبال کرسکتی تھی۔ اس سے قبل وہ ایگبرٹ کو ایک اسپیشل کوڈ والے خط کے ذریعے اپنے منصوبے سے آگاہ کرچکے تھے۔ اس میدان میں دونوں بھائیوں نے اپنے اپنے طیاروں کے پُرزوں کو دوبارہ جوڑ کر اُنہیں پرواز کے قابل بنایا۔ اور مناسب وقت کا انتظار کرنے لگا۔ دونوں بھائی جانتے تھے کہ اگر ان کے طیاروں کو دیکھ لیا گیا تو بلاتامل اُنہیں فضا ہی میں گولی ماردی جائے گی۔ مگر وہ ہر قسم کی صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار تھے۔ بالآخر تیسری رات ۲۵ مئی ۱۹۸۹ء کو انہوں نے اپنے سفر کا آغاز کیا۔ موسم قدرے خراب تھا۔ مگر یہ خراب موسم ہی انگو اور ہولنگا کے لئے موزوں تھا۔ کیونکہ وہ اسی طرح وہ سرحدی محافظوں کی نگاہوں سے بچ سکتے تھے۔ دونوں طیارے فضا میں بلند ہوچکے تھے۔ آیئے! اس سنسنی خیز کہانی کے بقیہ واقعات انگو کی زبانی سُنتے ہیں۔

"میں نے ہولنگا کو ریڈیو ٹرانسمیٹر کے ذریعے ہدایت کی کہ وہ میرے طیارے کے پیچھے اپنے طیارے کو رکھے۔ اس وقت میرے اعصاب شدید تناؤ کا شکار تھے۔ میں نے اپنے دانتوں کو بُری طرح بھینچا ہُوا تھا۔ جُوں جُوں دیوارِ برلن قریب آتی جارہی تھی۔ ویسے ویسے میرے اضطراب میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ اب میں بچاس گز چوڑی اس پٹی کے قریب تھا جسے "نومینز لینڈ" کہا جاتا ہے۔ چند ہی لمحوں بعد ہم مشرقی برلن پر پرواز کر رہے تھے۔ ہمارا رُخ جنوب کی طرف تھا تاکہ وہاں ایک میدان میں طیارے کو لینڈ کیا جاسکے۔ میں نے اپنے طیارے کو اُس میدان میں اُتار لیا۔ جہاں ہماری ہدایت کے مطابق ایگبرٹ کو موجود رہنا تھا۔ ہولنگا کا طیارہ اوپر چکر لگا رہا تھا۔ تاکہ اگر ہمیں کسی مدد کی ضرورت ہو تو وہ ہمارے لئے کچھ کرسکے۔ جونہی میرا طیارہ میدان میں رُکا میں نے دیکھا کہ سو گز دُور سے ایگبرٹ ایک چھوٹا سا اٹیچی کیس تھامے میری طرف دوڑا چلا آرہا ہے۔ وہ اگرچہ اپنی پوری قوت سے دوڑ رہا تھا۔ مگر گزرتا ہُوا ہر لمحہ مجھے ایک صدی کے برابر محسوس ہو رہا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ پُوری قوت سے نہیں بلکہ "سلوموشن" میں دوڑ رہا ہے۔ جونہی وہ طیارے کے قریب پہنچا۔ میں نے اُسے برابر کی سیٹ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور اُس کے ہاتھ میں ایک ہیلمٹ پکڑا دیا۔ تاکہ وہ اُسے فوراً پہن سکے۔

اس کے بعد بڑی پھُرتی سے میں نے طیارے کو موڑا۔ اور ایکسی لیٹر دبا دیا۔ سو گز دوڑنے کے بعد طیارہ فضا میں بلند ہونے لگا۔ میں نے ریڈیو ٹرانسمیٹر پر ہولنگا کو ہدایت کی کہ وہ دوبارہ مغربی جرمنی کی طرف روانہ ہوجائے۔ میرے سامنے ہولنگا کا طیارہ بحفاظت دیوارِ برلن کو عبور کرگیا۔ اب میری باری تھی۔ دیوارِ برلن کو عبور کرتے ہوئے میرے اعصاب ایک بار پھر تن گئے۔ مجھے ایسا

لگا جیسے کسی بھی لمحے مشین گن چلنے کی آواز آئے گی اور ... خوف کی ایک لہر میرے جسم میں دوڑ گئی۔ چند لمحوں کے بعد ہم نے نومینز لینڈ بھی عبور کر لیا۔ میں نے نیچے نگاہ ڈالی تو مغربی برلن کی چمکتی ہوئی روشنیاں نظر آئیں۔ پانچ منٹ بعد ہم دوبارہ لینڈ کر رہے تھے۔ میرا طیارہ رُک چکا تھا۔ پوری مہم میں کل ۳۱ منٹ صرف ہوئے تھے۔ مجھے یہ ۳۱ منٹ۔ ۳۱ صدیوں کے برابر محسوس ہو رہے تھے۔

جس طرح بارش کے قطرے ٹپکتے ہیں بالکل اسی طرح میری آنکھیں بھی آنسوؤں سے دُھندلا گئی تھیں۔ مجھے مہم کی کامیابی کا اب تک یقین نہیں آ رہا تھا: "تم آزاد ہو گئے ہو ایگبرٹ ... تمہیں آزادی مبارک ہو میرے بھائی ..." میں نے فرطِ مسرت سے ایگبرٹ کو گلے لگا لیا۔ اتنے میں اپنے طیارے سے اُتر کر ہولگا بھی دوڑتا ہُوا آیا۔ اور ہم دونوں سے لپٹ گیا۔ ہم دونوں ہی ایگبرٹ سے لپٹ کر رو رہے تھے۔ میں نے ۱۹۷۴ء میں مشرقی جرمنی چھوڑا تھا۔ اور ہولگا نے ۱۹۸۱ء میں۔ اس دوران ہم نے ایگبرٹ کو صرف اسپیشل کوڈ میں چند خطوط لکھے تھے۔ اب اتنے عرصے بعد ہم ملے تھے تو ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے یہ کوئی خواب ہے۔ مگر نہیں! یہ خواب نہیں حقیقت تھا۔ کہ ہم آزاد تھے۔ جبر اور گھٹن کے ماحول سے آزاد۔

ہم تینوں بھائیوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ تھاما۔ پھر زور سے ہنسے۔ اتنے میں ہولگا نے دونوں مٹھیوں کو بھینچ کر زوردار نعرہ لگایا۔

"ہم آزاد ہیں ... ہم آزاد ہیں ... ہم نے کمیونسٹوں کو شکست دے دی۔ آزادی مبارک۔" کسی نے سچ ہی کہا ہے کہ "خدا اُن کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں۔"

■

نام بھی انعام بھی

مقابلۂ مضمون نویسی کے سلسلے میں ادارہ آنکھ مچولی کو بے شمار مضامین موصول ہوئے۔ یہ مضامین اپنے مصنفین کی محنت اور دلچسپی کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ منصفین کے ایک پینل نے جن تین مضامین کو انعام کا حقدار قرار دیا ہے۔ اُن کے نام یہ ہیں۔

۱. "یہ دل کا معاملہ ہے"۔ زہرہ۔ اسلام آباد۔ (اوّل)

۲. "آپ کا دماغ کیسے کام کرتا ہے؟" شاہد خان۔ دادو۔ (دوم)

۳. "قصہ ایک موجد کا" شاہد محمود عابد تلہ گنگ۔ ضلع چکوال۔ (سوم)

ادارہ انعام یافتگان کو دلی مبارک باد پیش کرتا ہے۔

اسامہ بن سلیم

جُ سْ تُ جُ وْ شَ رْ طْ ـــ ہ ہَ ـــ ے

ذھانت اور معلومات کا منفرد ماہانہ مقابلہ

"جستجو شرط ہے" کا آخری مقابلہ حاضر ہے - ہم نے گزشتہ ۱۲، ماہ میں اس سلسلے کے ۱۰، مقابلے آپ کی علمی جستجو اور دلچسپی کے لئے پیش کئے، جنہیں آپ نے پسند کیا۔ اس پسندیدگی پر ہم آپ کے ممنون ہیں - اللہ نے چاہا تو خوفناک نمبر کے بعد ہم کسی نئے طرز کے معلوماتی مقابلے کے ساتھ حاضر ہوں گے ۔

ذیل میں دیئے گئے سوالات کو بغور پڑھئے ۔اور جواب تک پہنچنے کی کوشش کیجئے ۔اس مقابلے میں شرکت کا طریقہ تو آپ جانتے ہی ہوں گے ۔

سوال پڑھئے اور سوال کے بعد دیئے گئے ہر نام میں سے ایک حرف چنئے ۔ گویا جتنے نام ہیں اتنے ہی حروف پر مبنی جواب بھی ہوگا ۔

ہر سوال کے آخر میں شعر کا مصرعہ جواب تک پہنچنے میں آپ کا مددگار ہوگا ۔

شرکت کی آخری تاریخ ۱۵، دسمبر ۸۹ء ہے - ۱۵، تاریخ تک موصول ہونے والے درست جوابات کی قرعہ اندازی ہوگی ۔اور تین خوش قسمت ساتھی تحائف حاصل کریں گے ۔ تو پھر ذہنی طور پر تیار ہو جائیے ۔ آخری مقابلے کے جوابات تلاش کرنے کے لئے ... مقابلہ حاضر ہے ۔

سوالات

۱۔ تاریخِ اسلام کی اہم مساجد کے ناموں میں ایک مشہور مسجد کا نام تلاش کریں۔

۱۔ مسجدِ حدیبیہ ۲۔ مسجد الرائیۃ ۳۔ مسجدِ قبا ۴۔ مسجدِ نمرہ ۵۔ مسجدِ نبویؐ ۶۔ مسجدِ غمامہ ۷۔ مسجدِ جن ۸۔ مسجد مشعر الحرام ۹۔ مسجدِ قبلتین

اشارہ ☆ مسلمانانِ عالم کی حمیّت کا یہ مسئلہ ہے

۲۔ بُتوں میں بُت شکن کا نام تلاش کیجئے۔ یہ محترم نام انبیاؑ کے ناموں میں سے ایک ہے۔

۱۔ لات ۲۔ ہبل ۳۔ کرشن ۴۔ منات ۵۔ ہنومان ۶۔ سیتا ۷۔ رام

اشارہ ☆ کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے

۳۔ کرکٹ کی اصطلاحوں میں ایک مشہور کرکٹ کے میدان کو تلاش کیجیے۔

۱۔ اسٹمپ ۲۔ ایل بی ڈبلیو ۳۔ لیگ بائی ۴۔ وائیڈ بال ۵۔ نوبال ۶۔ اسکور ۷۔ فیلڈنگ

اشارہ ☆ جنم بھومی ہے کرکٹ کی فرنگی کی زمینوں پر

۴ دنیا کے مشہور فوجی حکمرانوں میں ایک معروف فوجی حکمراں کا نام تلاش کیجئے۔

۱۔ جنرل ضیاء الرحمٰن (بنگلہ دیش) ۲۔ جنرل جیروزلسکی (پولینڈ) ۳۔ جنرل کنعان ایورن (ترکی) ۴۔ صدر صدام حسین (عراق) ۵۔ جنرل ڈیگال (فرانس) ۶۔ جنرل یحییٰ خان (پاکستان)، ۷۔ کرنل قذّافی (لیبیا)۔۔۔

اشارہ ☆ دمِ آخر بھی قرآں کو لگا رکھا تھا سینے سے

۵۔ ذیل میں کچھ شہروں کے متروک نام دیئے جارہے ہیں۔ ان میں ایسے ہی ایک شہر کا نام دیکھئے۔ جسے عام لوگ اب اس نام سے نہیں جانتے۔

۱۔ برش پور (پشاور) ۲۔ خان گڑھ (جیکب آباد) ۳۔ منٹگمری (ساہیوال) ۴۔ کلاچی (کراچی) ۵۔ لائلپور (فیصل آباد) ۶۔ فورٹ سنڈیمن

اشارہ ☆ پہن کے یہ کوٹ سچ ہے بہنا کہ تم تو رانی سی لگ رہی ہو

۶۔ دنیا کے مشہور وزرائے خارجہ میں ایک مشہور وزیر خارجہ کا نام پوشیدہ ہے۔ دیکھیں آپ کی ذہانت تلاش کرتی ہے یا نہیں۔

۱. آغا شاہی (پاکستان) ۲. ایگنز ینڈر ہیگ (امریکہ) ۳. ذوالفقار علی بھٹو (پاکستان) ۴. عزیز احمد (پاکستان) ۵. علی اکبر ولایتی (ایران) ۶. نرسمہا راؤ (بھارت) ۷. آندرے گرومیکو روس ۸. جیفری ہاؤ (برطانیہ) ۹ طارق عزیز (عراق)

اشارہ ☆ عجب "میسنجر" تھا جس نے ناراض چینیوں سے گلے ملایا

۷. علامہ اقبال کی بچوں کے لئے لکھی گئی مشہور نظموں میں سے ایک نظم کے عنوان کی تلاش مقصود ہے۔ ہماری مدد کر دیجئے۔

۱. ایک مکڑا اور مکھی ۲. ماں کا خواب ۳. بچے کی دعا ۴. ایک گائے اور بکری ۵. پرندے کی فریاد ۶. پہاڑ اور گلہری۔

اشارہ ☆ میں راہ میں روشنی کر دوں گا۔

۸. دنیا کی مشہور مگر غیر سیاسی خواتین میں سے ایک معروف ترین خاتون کا نام تلاش کیجئے۔

۱. شکریہ خانم ۲. مادام کیوری ۳. والنتینا نکولائی واترشکووا ۴. اسٹیفی گراف ۵. اگاتھا کرسٹی ۶. نادیہ کیمونچی ۷. فاطمہ شاہ

اشارہ ☆ لگا کے چشمہ جو کھیل کھیلا تو مار ماری ٹکا ٹکا کے

۹. مروجہ علوم میں سے اپنی حیثیت منواتا ہوا ایک جدید علم۔ بتائیے تو بھلا کون سا۔

۱. نباتیات ۲. فلکیات ۳. سیاسیات ۴. معاشیات ۵. عمرانیات ۶. بشریات

اشارہ ☆ "فرائیڈ" محترم اک نام ہے اس علم حاضر کا

۱۰. رشتوں میں ایک رشتہ تلاش کیجئے۔ بہت غور سے کہیں آپ بھٹک نہ جائیں۔

۱. بھائی ۲. دیور ۳. ماں ۴. نند ۵. سسر ۶. خاوند ۷. ساس ۸. بیٹی ۹. پوتا ۱۰. بیوی۔

اشارہ ☆ ساری خدائی ایک طرف ....

انعام حاصل کرنے والے تین خوش نصیب ساتھیوں کے نام۔

---

۱. آصف کریم۔ شاہی بازار، حیدرآباد ۲. ناظمہ خان، عزیز آباد، کراچی ۳. سیف اللہ اعوان ٹوبہ ٹیک سنگھ۔

درست جواب ارسال کرنے والے ساتھیوں کے نام:-

۱۔ سیّد سرفراز عباس عابدی - ملیر توسیعی کالونی کراچی ۔ ۲۔ نعیم اللہ اعوان، ٹوبہ ٹیک سنگھ ۳۔ ریحان مبارک نارتھ ناظم آباد کراچی - ۴۔ صدف مبارک، نارتھ ناظم آباد، کراچی ۔ ۵۔ طارق مظہر طارق ۶۔ فرخ ناز، حیدر آباد ۷۔ محمّد عمر فوّاد سعود آباد کراچی - ۸۔ انیسہ مُغل ۔ نامعلوم ۹۔ محمّد عمران قادر۔ ٹنڈو آدم ۱۰۔ فوزیہ رفیق ۔ ناظم آباد کراچی ۔ ۱۱۔ عاشق حسین نازش سنجھورو ۱۲۔ محمّد ریحان شیخ ۔ پی ای سی ایچ ایس کراچی ۱۳۔ شبیر حسن، نواب شاہ ۱۴۔ ذوالفقار حیدر سنجھورو ۱۵۔ ممتاز علی راہموں، عمر کوٹ ۔ ۱۶۔ محمّد رمضان راہموں۔ عمر کوٹ

ایک غلط جواب ارسال کرنے والے ساتھیوں کے نام:-

۱۔ حافظ عمر فاروق ۔ رحیم یار خان ۲۔ مونا کنول خانزادہ ۔ لطیف آباد۔ حیدر آباد ۳۔ اویس خانزادہ ... لطیف آباد ۔ حیدر آباد ۴۔ بابر جاوید، لطیف آباد حیدر آباد ۵۔ سبا راحت نوشین۔ اسلام آباد ۶۔ عاصم حمید بٹ ۔ گلشن اقبال کراچی۔

ماہ نومبر ۸۹ء میں پوچھے گئے سوالات کے جوابات

۱۔ حکمت یار ۲۔ پیلے ۳۔ لائف ۴۔ واپڈا ۵۔ وکرم

۶۔ سیٹو ۷۔ یہودیت ۸۔ ٹالسٹائی ۹۔ پلوٹو ۱۰۔ مہران

کوپن کا صفحہ

آنکھ مچولی میں موجود مختلف نوعیت کے کوپن کاٹ لینے کی وجہ سے نہ صرف رسالہ بدنما ہو جاتا تھا بلکہ کوپن کی پُشت پر موجود تحریر بھی ضائع ہو جاتی تھی۔ اب آپ کی سہولت کی خاطر ہم نے تمام کوپن کو ایک صفحے پر یکجا کر دیا ہے۔

مقابلۂ معلومات "جستجو شرط ہے" میں شامل ہونے کا کوپن

نام ——————— کلاس ——— عمر ———
پتہ ———————————————
——————— حاصل کردہ پوائنٹس ———————

قلمی دوستی "سالگرہ کے ساتھی" میں شرکت کا کوپن

نام ——————— جماعت ———————
تاریخ و سن پیدائش ——————— مشاغل ———————
پسندیدہ مضمون ——————— بڑے ہو کر کیا بننا چاہتے ہیں ———————
پتہ ———————————————

آنکھ مچولی کی سالانہ خریداری کا کوپن

نام خریدار ——————— رسالہ کس ماہ سے جاری کیا جائے ———————
پتہ ——————— فون نمبر (اگر ہو) ———————
میں ۱۵۰ روپے منی آرڈر کر رہا ہوں۔ مجھے آنکھ مچولی جاری کر دیا جائے ——— یا ——— میں دس روپے کے ڈاک ٹکٹ بھجوا رہا ہوں۔ مجھے ایک سال کے لئے رسالہ جاری کر دیا جائے۔ میں پہلا رسالہ ۱۴۰ روپے وی پی کے عوض چھڑوا لوں گا۔
دستخط ———————

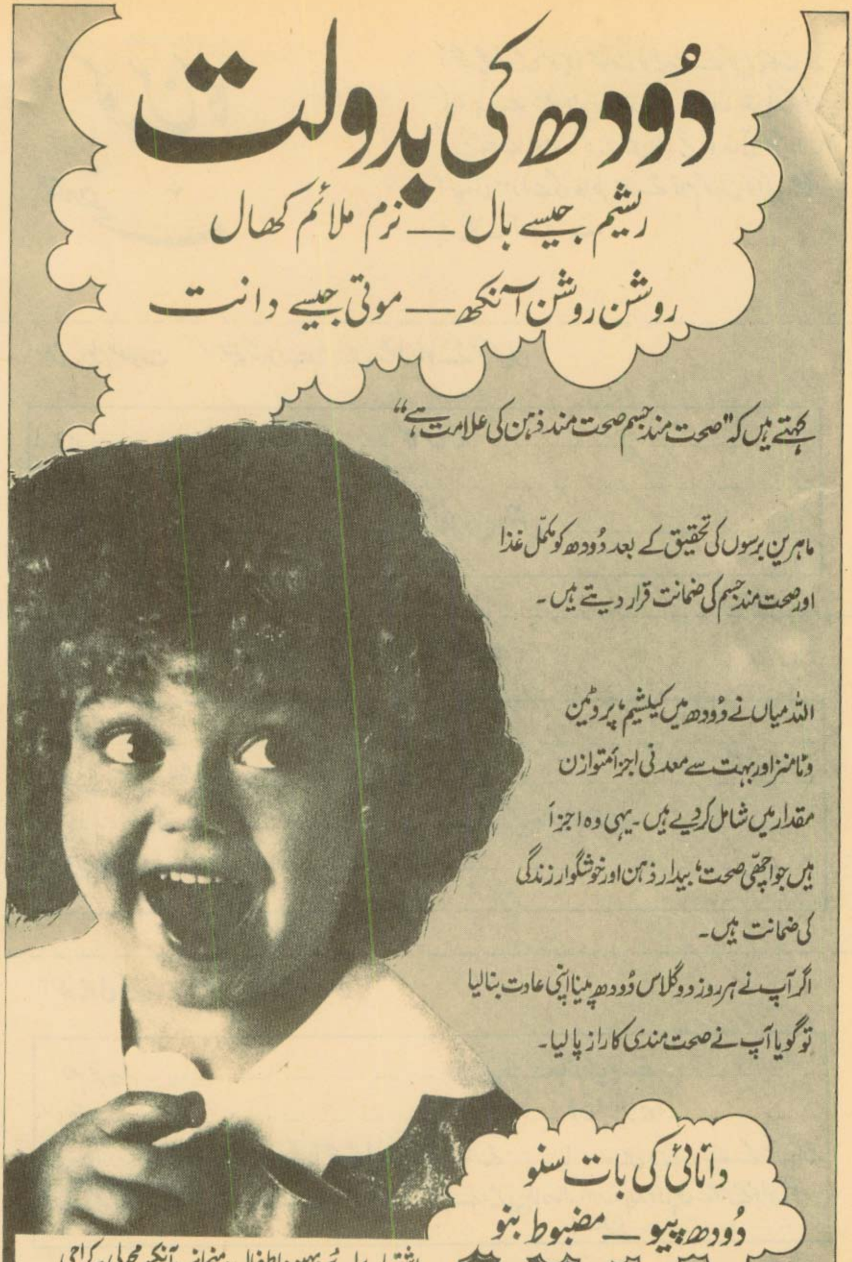

دُودھ کی بدولت
ریشم جیسے بال — نرم ملائم کھال
روشن روشن آنکھ — موتی جیسے دانت
کہتے ہیں کہ "صحت مند جسم صحت مند ذہن کی علامت ہے"
ماہرین برسوں کی تحقیق کے بعد دُودھ کو مکمّل غذا
اور صحت مند جسم کی ضمانت قرار دیتے ہیں۔
اللہ میاں نے دُودھ میں کیلشیم، پروٹین
وٹامنز اور بہت سے معدنی اجزا متوازن
مقدار میں شامل کر دیے ہیں۔ یہی وہ اجزا
ہیں جو اچھّی صحت، بیدار ذہن اور خوشگوار زندگی
کی ضمانت ہیں۔
اگر آپ نے ہر روز دو گلاس دُودھ پینا اپنی عادت بنا لیا
تو گویا آپ نے صحت مندی کا راز پا لیا۔
دانائی کی بات سنو
دُودھ پیو — مضبوط بنو
اشتہار برائے بہبود اطفال، منجانب آنکھ مچولی - کراچی

MASS

انٹرویور: محمد سلیم مُغل
شریکِ گفتگو: زینب خالد

موٹر سائیکل پر دُنیا کا سفر کرنے والے
جاپانی میاں بیوی سے دلچسپ گفتگو

دورِ جدید کے

ابنِ بطوطہ اور ابنِ بطوطی

مخاطب: اکیرا سائیتو اور نوریکو سائیتو

میری ایک عزیزہ نے مجھے ٹیلیفون پر بتایا کہ ہمارے گھر ایک جاپانی جوڑا آیا ہُوا ہے ...

"کیسا جوڑا ..؟" میں نے پوچھا .. "شلوار قمیض کا یا پینٹ شرٹ کا ...؟"

"ارے نہیں بھئی ... انسانوں کا جوڑا ... میاں اور بیوی کا جوڑا"

"اچھا اچھا، سمجھ گیا ... معاف کیجئے گا۔ دراصل جاپانی مصنوعات ذہن پر اس قدر سوار رہتی ہیں کہ بسا اوقات کچھ اور سُوجھتا ہی نہیں ...

میری عزیزہ نے مجھے رات کے کھانے پر مدعُو کرتے ہوئے کہا کہ "مجھے یقین ہے کہ آپ ان سے مل کر اور یہ آپ سے مل کر خوش ہوں گے۔ آپ ضرور آئیے گا"

رات کے کھانے پر جاپانی مہمانوں سے ملاقات ہوئی۔ ان کے چہروں پر کم سنی کے آثار دیکھنے کے بعد ہمارا پہلا تاثر یہی تھا جیسے یہ دونوں جاپانی مہمان کسی اسکول کے طالب علم ہوں، اور کسی وجہ سے اپنے امّی ابو سے رُوٹھ کر پاکستان

آگئے ہوں۔ مگر تھوڑی ہی دیر بعد اُس وقت ہمارا تاثر حیرت میں تبدیل ہونے لگا۔ جب مہمانوں نے اپنے تعارف پر مبنی ایک ٹائپ شدہ کاغذ ہمارے ہاتھ میں تھما دیا۔ اس کاغذ پر جو کچھ لکھا تھا ہم اُسے جُوں کا توں آپ تک پہنچا رہے ہیں۔

"ہم اکیرا اسائیتو اور نوریکو سائیتو (میاں بیوی) ہیں۔ اکیرا (خاوند) ٹوکیو کے جنرل اسپتال میں اکوپنکچرسٹ ہیں جب کہ نوریکو، جاپان کے روایتی فن کیمونو ڈریسنگ (مخصوص جاپانی لباس پہنانے کا فن) اور پھولوں کی تزئین کی انسٹرکٹر ہیں۔

ہم دونوں فطرت کے دیوانے ہیں۔ اور موٹر سائیکل پر گھومنے پھرنے کے بے حد شوقین۔ اکیرا کے والد نے ۵ سال کی عمر میں اُسے فطرت سے محبت کرنے کا شوق دیا۔ اور اکیرا نے فطری حُسن کو قریب سے دیکھنے کے لئے دس سال کی عُمر میں سائیکل پر تنہا جاپان کے مختلف علاقوں کا سفر کیا۔ نوریکو نے بھی ۱۹ سال کی عمر سے موٹر سائیکل پر گھومنے پھرنے کا آغاز کیا اور اُن کا یہ شوق آج بھی جاری ہے۔ ہم دونوں اپنی علیحدہ علیحدہ موٹر سائیکلوں پر دنیا کے تقریباً ۴۰ مُلکوں کی سیر کرتے ہوئے پاکستان پہنچے ہیں۔ دنیا بھر کے اس طویل اور طولانی سفر کا مقصد دُنیا کے مختلف مُلکوں کو دو پہیوں پر گھُوم پھر کے دیکھنا، لوگوں سے ملنا، اُن سے دوستی کرنا اور مختلف تہذیبوں اور ثقافتوں کو دیکھ کر اپنے مشاہدے کو وسیع کرنا ہے۔ ہمارا یہ عالمی سفر ۵ سالوں کی منصوبہ بندی کے بعد جون ۱۹۸۷ء میں شروع ہُوا۔ جو ابھی تک جاری ہے۔ اور توقع ہے کہ جون ۱۹۹۰ء میں کسی وقت اختتام کو پہنچے گا۔ ہمارا یہ سفر ان برّاعظموں یا خطوں پر محیط ہے۔ شمالی امریکہ، جنوبی امریکہ، یورپ، افریقہ، مشرقِ وسطیٰ، ایشیا، اوشیانا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ۔

ہمیں اس سفر کے لئے دونوں موٹر سائیکلیں یاماہا کمپنی نے اس اضافی سہولت کے ساتھ تحفتاً دی ہیں کہ ہم دنیا بھر میں جہاں جائیں یاماہا کمپنی کے مخصوص سروس سینٹر سے اس کی مُفت سروس کروا سکتے ہیں۔

آپ اپنے مُلک کی مخصوص ثقافتی زندگی کے حسین رنگوں کے مشاہدے میں ہم سے جو بھی تعاون کریں گے۔ ہم اس کے لئے آپ کے ممنون ہوں گے۔ ہمیں امید ہے کہ ہماری اس مہم میں آپ کا ساتھ بے تکلفی اور محبت پر مبنی ہوگا۔

اکیرا اور نوریکو سائیتو"

ہم نے یہ مفصّل تعارف نامہ پڑھنے کے بعد اپنی حیران آنکھوں سے ایک بار پھر اس جوڑے کو بغور دیکھا، جسے ہم اب تک اسکول کے بچے سمجھ رہے تھے۔ اس بار ہمیں یہ پہلے سے قدرے بڑے معلوم ہوئے۔ مگر اتنے بڑے بھی نہیں مجھ سے رہا نہ گیا اور میں نے پوچھ ہی لیا۔

● بھائی اکیرو اگر آپ لوگوں کے ہاں اصل عمر کو چھُپانے کا رواج نہ ہو تو براہِ کرم اس راز سے پردہ اُٹھا دیں۔

اکیرو نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا اور کہا "آپ کا کیا خیال ہے، ہماری عُمریں کیا ہوں گی؟"

میں نے انہیں محض اپنے سے بڑا ثابت کرنے کے لئے کہہ دیا کہ "یہی کوئی ۳۵ سال کے لگ بھگ۔"

شمالی امریکہ کے شدید برفانی راستوں سے گزرتے ہوئے اکیرا اور نوریکو

"جی نہیں ... ہم آپ کے اندازے سے کچھ چھوٹے ہیں۔ میں ۳۲ سال کا ہوں اور نوریکو ۳۱ سال کی۔"

● خیر سے آپ لوگوں کی شادی کب ہوئی ؟

"ہماری شادی ۱۹۸۲ء میں ہوئی۔"

● کوئی چھوٹو موٹو ...؟

"نہیں ابھی تک کوئی نہیں۔"

● آپ دونوں نے اب تک اپنی تعلیم کے متعلق کچھ نہیں بتایا، کہیں ایسا تو نہیں کہ پڑھنے لکھنے کا وقت بھی موٹر سائیکل چلا کے گذار دیا ...؟

"جی نہیں ... ایسا نہیں ہوا ... ہم دونوں نے بی اے کیا۔ میں نے ٹوکیو کی رسیتو (RISYO) یونیورسٹی سے اور نوریکو نے وائیو یونیورسٹی سے۔"

ایک موقعہ پر جب میں نے نوریکو کو "بھابی" کہہ کر مخاطب کیا تو وہ حیرت سے بولیں۔

"WHAT BHABHI"

تب میں نے انہیں تسلی دی اور سمجھایا کہ بھابی بھائی کی بیگم کو کہتے ہیں۔ یہ سن کر ان کا اطمینان ہوا اور بے اختیار ان کے منہ سے نکلا۔ "THAT'S VERY GOOD"

چونکہ ہماری تمام تر دلچسپی اس سیاح جوڑے کے سفر کی روداد سننے میں تھی۔ اس لئے میں نے ان کے رسمی تعارف کے بعد جو پہلا سوال پوچھنا مناسب سمجھا وہ کچھ یوں تھا۔

● موٹرسائیکل کے ذریعے دُنیا کا سفر کرنے کا فیصلہ آپ نے کچھ جلد بازی میں نہیں کر لیا؟ میرا مطلب ہے دو پہیوں والی سواری پر دنیا کے پُرخطر راھوں سے گذرنا خاصا مشکل کام ہے۔۔ کیا اچھا نہ ھوتا اگر آپ جیپ یا کار کے ذریعے اپنا شوق پورا کر لیتے ...؟

"کار یا جیپ میں دُنیا کا سفر ہو سکتا ہے مگر اس عمر میں نہیں پچاس سال کی عمر کے بعد، یہ عمر تو ایسی ہے کہ اس میں مشکلات سے نبرد آزما ہونا اچھا لگتا ہے۔ خطروں سے کھیلنے میں مزہ آتا ہے۔ موٹرسائیکل پر سرد گرم موسموں کا سامنا کرتے ہوئے پیچیدہ راستوں پر چلتے ہوئے۔ پہاڑوں کے نشیب و فراز طے کرتے ہوئے اور راہ کی دیگر مشکلات سے گزرتے ہوئے جو لُطف آتا ہے۔ وہ لُطف کار یا جیپ میں کہاں آسکتا ہے ...؟"

● بھائی یہ لُطف آپ خود ھی لے لیں اپنی بیوی بے چاری پر رحم کریں اسے اپنے ساتھ کیوں مصیبت میں ڈال رکھا ھے؟

"نوریکو مجھ سے زیادہ باہمت ہے"۔۔ اکیرو نے کہا۔

● اکیرو ٹھیک کہہ رہے ھیں؟ میں نے نوریکو سے پوچھا۔

"ہاں... مجھے تو بہت مزہ آرہا ہے اس سفر میں بلکہ میرا تو خیال ہے کہ ہم ایک بار پھر دنیا کے سفر پر نکلیں"۔ ایک لڑکی کے منہ سے ایسی حوصلے کی بات کم از کم میں اپنے معاشرے میں تصور نہیں کر سکتا۔ اپنی کم ہمتی کا خیال آتے ہی مجھے ایسا لگا جیسے نوریکو نے یہ جواب مجھے شرمندہ کرنے کے لئے دیا ہو۔ میں نے جلدی سے موضوع بدلنے کی کوشش کی۔

● اچھا تو یہ بتائیے کہ آپ اب تک کتنے اور کون کون سے ممالک کا سفر کر چکے ھیں؟

اس سوال کے جواب میں اکیرو اور نوریکو نے دُنیا کا نقشہ میز پر پھیلا دیا۔ اور ایک ایک نام گنوانا شروع کیا۔ "امریکہ، کینیڈا، میکسیکو، چلی، پیرو، ارجنٹائن، یوروگوائے، برازیل، انگلستان، اسکاٹ لینڈ، لکسمبرگ، فرانس، بیلجئم، مغربی، اور مشرقی جرمنی، ڈنمارک، سوئیڈن، ناروے، فن لینڈ، ہالینڈ، آسٹریا، لیچ ٹن سٹین، سوئٹزر لینڈ، اٹلی، موناکو، اسپین، پرتگال، تیونس، الجیریا، مالی، موراکو، یوگوسلاویہ، یونان، ترکی، ایران اور پاکستان۔"

● میں نے آپ سے اُن ممالک کے نام نہیں پوچھے جو نقشے میں موجود ھیں۔ بلکہ وہ ملک پوچھے ھیں جو آپ دیکھ چکے ھیں۔؟ میں نے حیران ھوتے ھوئے سوال کیا۔

"جی ہاں... ہم نے بھی وہی مُلک بتائے ہیں جو ہم دیکھ چکے ہیں، بلکہ شاید ہم کچھ مُلک گنوا نہیں سکے۔ یقیناً ان کی تعداد چالیس سے زیادہ ہوگی۔ اپنے سفر کی کہانی سُناتے ہوئے اکیرا اور نوریکو نے بتایا کہ اُن کے سفر کا آغاز ٹوکیو سے ہُوا جہاں سے انہوں نے لاس اینجلس کے لئے ہوائی سفر کیا... ظاہر ہے ایک برِاعظم سے دوسرے برِاعظم تک موٹرسائیکل کے ذریعے تو نہیں جایا جا سکتا تھا۔ اسی طرح جہاں جہاں بھی سفر کی راہ میں سمندر حائل ہُوا۔

ہمیں ہوائی سفر کا سہارا لینا پڑا جب ہم جہاز میں ہوتے تو ہمارا سامان اور موٹر سائیکلیں بوٹ کے ذریعے سفر کر رہی ہوتیں ہمیں دُنیا کا ہر مُلک اچھا لگا۔ ہر ملک کی اپنی خوبصورتی ہے ہر جگہ کی ثقافت میں ایک خاص طرح کا حسُن ہے۔ اس لئے ممالک کا اس طرح موازنہ نہیں کیا جا سکتا کہ ایک کو دوسرے سے بہتر ثابت کیا جائے۔ البتہ اگر ہم سے یہ کہا جائے کہ آپ کس ملک کو اپنی رہائش کے لئے پسند کریں گے تو ہمارا جواب کینیڈا ہوگا اور اگر آپ یہ کہیں کہ کون سی جگہ ایسی ہے جسے دوبارہ دیکھنے کی خواہش ہے تو اس کا جواب ہے الاسکا۔"

● سفر میں کہیں دشواریاں بھی پیش آئیں یا مسائل کا سامنا بھی کیا...؟

"نہیں بہت زیادہ تو نہیں۔ اس اعتبار سے ہم کافی خوش قسمت رہے۔ ہم نے خود بھی احتیاط کی، رات کو سفر نہیں کیا۔ ہماری خوش قسمتی کہ نہ تو کوئی حادثہ پیش آیا اور نہ ہی کوئی چوری چکاری ہوئی۔ البتہ بعض جگہوں پر بڑی دلچسپ صورتحال سے گزرنا پڑا۔ شمالی امریکہ میں رات کو ہمارے کیمپ کے پاس کافی ریچھ آ گئے مگر ان کی مہربانی کہ بغیر کچھ کہے واپس چلے گئے۔ ایسا دوبار ہُوا۔ اسی طرح الاسکا میں ہماری بوٹ خطرناک وہیل مچھلیوں میں گھر گئی۔ تقریباً ۲۰، وہیل ہوں گی مگر انہوں نے ہمیں کھانے کے بجائے بہتر سمجھا کہ "سیل" کو کھالیں۔ اس طرح ہم وہاں بھی محفوظ رہے۔ افریقہ سے گزرتے ہوئے دنیا کے سب سے بڑے ریگستان "سہارا" سے بھی گزرے۔ اس صحرا میں ہمیں ریت کے طوفان اور بگولوں نے گھیر لیا تھا۔ مگر یُوں سمجھئے کہ وہاں بھی خیریت ہی رہی۔ بعض جگہوں پر برفباری اور موسم کی شدت نے تنگ کیا۔"

● سُنا ہے "سہارا" میں بے سہارا ہونے کا بڑا خطرہ ہوتا ہے۔ اس عظیم ریگستانی سراب سے گزرنا کیسا لگا۔

"اس صحرا میں ہم نے ۱۲۰۰ کلومیٹر کا فاصلہ تین دن مسلسل سفر کر کے طے کیا۔ اس ریگستان میں پانی کے کچھ مسائل پیش آئے اور یہ کہ صحرائی بگولوں نے تنگ کیا۔ یہ صحرائی سفر سخت سردی میں گزرا اور ہمیشہ یاد رہے گا۔"

● سرحد عبور کرتے ہوئے کہیں مشکل پیش آئی؟

"کہیں نہیں، ہر ملک کے لوگ اچھے دوست بن کر ملے۔ ایران میں زیادہ سختی ہے مگر اتنی زیادہ بھی نہیں۔ ایرانی سرحد عبور کرتے

ہوئے انہوں نے سب سے پہلے نوریکو کو برقعہ پہنایا۔ اور کہا کہ حجاب کے بغیر ایران میں داخل نہیں ہو سکتے:

● نوریکو آپ کو برقعہ پہن کر موٹر سائیکل چلانا کیسا لگا؟

"اچھا لگا۔ مزہ آیا۔۔۔ ایرانی میزبان نے برقعہ تحفے میں بھی دیا۔"

● برسہا برس کے سفر میں اخراجات بھی تو اُٹھے ہوں گے۔ سفر کے اخراجات کے لئے رقم کا بندوبست کس طرح کیا۔۔۔؟

"جاپان میں ۵ سال تک پیسے بچائے۔ مگر یہ رقم اتنی نہ تھی کہ اس سے دُنیا کا سفر ممکن ہو۔ تاہم ہم نے سفر کا آغاز کیا۔ اور ہمارے اخراجات کا مسئلہ بھی حل ہوتا گیا۔ ہر ملک میں محبت کرنے والے میزبان ملے۔ چونکہ کھانا پینا، رہنا اکثر دوسروں کے پاس ہوتا تھا۔ اس لئے محدود بجٹ میں ہمارا گزارا ہوتا گیا۔ لوگوں نے ہمیں بہت سے تحفے تحائف اور بے اندازہ محبّتیں دیں، یوں ہمیں سفر کہیں بھی دشوار نہیں لگا۔"

● کہیں گھر کی یاد بھی آئی؟

"اس یاد کو ہم نے کہیں بھی قریب نہیں آنے دیا اگر ایسا نہ کرتے تو مشکل ہو جاتی۔ البتہ گھر سے خط و کتابت رہی ہم اپنے والدین کو لکھ دیتے کہ ہم آئندہ کس ملک میں ہوں گے، وہ لوگ اُسی ملک کے جاپانی قونصل خانے میں خط لکھ دیتے یوں ہمیں ہر ملک میں خط ملتے رہے۔"

● پاکستان کیسا لگا؟ سچ سچ کہیئے گا؟

"پاکستان بہت اچھا ملک ہے، یہاں کے لوگ اچھے ہیں اور محبت کرنے والے ہیں۔ بس پاکستان میں ایک چیز تکلیف دہ لگی۔ اور وہ ہے ایران کی سرحد سے کوئٹہ تک کا راستہ۔ یہ راستہ بہت خراب ہے۔ ۸۰۰ میل کا یہ راستہ ہم نے ۲۴ گھنٹے میں طے کیا۔ شاید اتنا خراب راستہ پوری دنیا میں کہیں نہ ہو۔"

● کچھ اپنی موٹر سائیکل کے بارے میں بتائیں گے؟

"ہماری موٹر سائیکلیں یاماہا کی چھ سو سی سی کی (یورپ ماڈل) طاقتور موٹر سائیکلیں ہیں۔ ہم نے اپنا اور اپنے سفری سامان کا وزن اس پر لادا اور انہیں پوری دنیا میں دوڑایا۔ انہوں نے ہمیں کہیں دھوکہ نہیں دیا۔ سوائے اسکاٹ لینڈ کے وہاں کچھ خرابی ہوئی مگر چونکہ موٹر سائیکل کو ہم اپنے لئے کھلونا سمجھتے ہیں اس لئے انہیں ٹھیک کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ ہم نے صفر میٹر سے آغاز کیا تھا۔ اب ان کا میٹر ساٹھ ہزار کلومیٹر سے زیادہ ہے۔"

● جاپان پہنچنے پر آپ کا یقیناً والہانہ استقبال ہوگا؟

"ممکن ہے ایسا ہو مگر سرکاری سطح پر نہیں ہوگا، عزیز دوست احباب یقیناً خوش آمدید کہیں گے۔"

● آپ اپنے تجربات کو کتابی شکل میں لکھنا پسند کریں گے؟

"ہم لکھیں گے تو ضرور مگر کتابی شکل میں تو نہیں البتہ وہاں کے موٹر سائیکل میگزین کے لئے لکھیں گے۔"

● کیا آپ چاہیں گے کہ آپ کو اس سفر کے نتیجے میں شہرت ملے؟

"نہیں ہمارا خیال ہے کہ شہرت نجی زندگی کو برباد کر دیتی ہے، ہم لوگ اپنی ذات میں مگن رہنا چاہتے ہیں۔ اپنے گرد مجمع نہیں لگانا چاہتے۔ ہم اپنی دنیا میں زیادہ خوش ہیں۔"

● دنیا کے بچے کیسے لگے...؟

"بچے ہر جگہ کے اچھے ہیں، معصوم ہیں، ان میں تمیز نہیں کی جاسکتی۔"

● ہمارے ساتھیوں کے لئے کوئی پیغام دیں گے؟

"ہمارا پیغام یہ ہے کہ بڑے سپنے دیکھو اور ان کی تعبیر کے لئے جدّوجہد کرو۔ زندگی کو کسی ایک مقصد سے ہم آہنگ کر دو۔ اور جدّوجہد میں کمی نہ آنے دو۔ اگر ایسا کیا تو کبھی ناکام نہیں ہو گے۔"

گفتگو جاری تھی کہ کھانے کی بھینی خوشبو نے خیالات کا شیرازہ بکھیر دیا۔ اہلِ خانہ نے کھانے کی میز پر بلایا تو یہ گپ شپ بھی یہیں پر ختم ہو گئی۔

ایسا نہیں تھا کہ اس گفتگو میں صرف امتحانی طرز کے سوالات پوچھے گئے ہوں۔ اور ان کا سیدھا سا جواب دے دیا گیا ہو بلکہ یہ پوری گفتگو قہقہوں، مسکراہٹوں، ہلکی پھلکی باتوں سے سجی ہوئی تھی۔ لیکن ان تمام باتوں کو اُس کے مکمل تاثر کے ساتھ یہاں بیان کرنا ممکن نہیں ہے۔ اس گفتگو میں ہماری بہن زینب بھی شریک رہیں اور انہوں نے کرید کرید کر مہمانوں سے بہت کچھ اگلوایا۔

آخر میں زینب نے مجھ سے پوچھا "سلیم بھائی کیا میں اچھی جرنلسٹ بن سکتی ہوں..." "ہاں کیوں نہیں بلکہ آپ نے تو عملاً ثابت کر دیا کہ آپ اچھی جرنلسٹ ہیں"۔ کھانے کے بعد ہم نے دورِ جدید کے ابنِ بطوطہ اور ابنِ بطوطی سے اجازت چاہی اور HAVE A NICE TRIP کی دعا دیتے ہوئے واپس آ گئے۔

لمحہ قبولیت کا

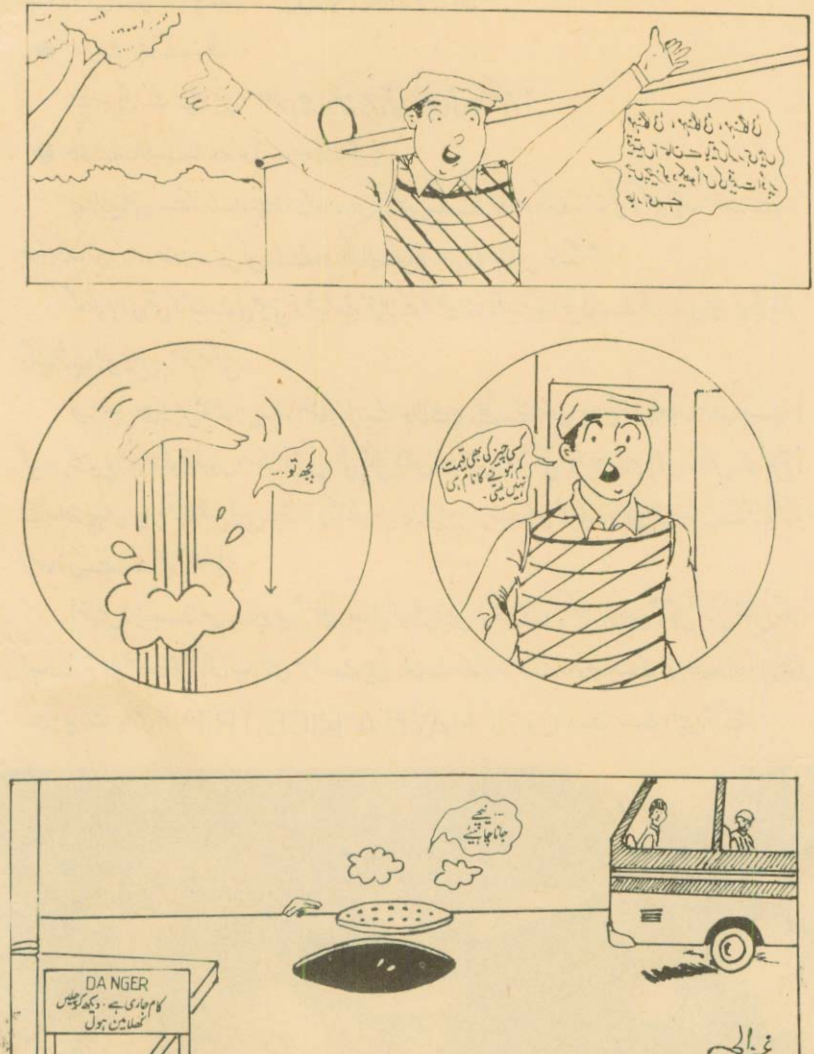

مقابلۂ کارٹون

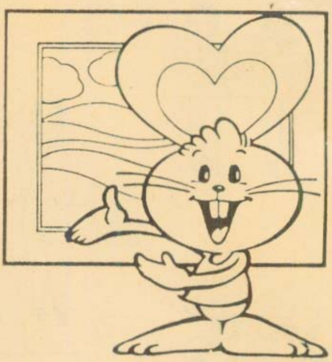

اے نگاہِ دوست
تُو نے خوب پہچانا مجھے

دو ماہ قبل ہم نے آپ کو دعوت دی تھی کہ آپ ادارۂ آنکھ مچولی کے ارکان کے کارٹون بنائیے۔ اس دعوت کے جواب میں ہمیں بہت سے کارٹون مِلے مگر اکثر کارٹون مدھم لائن ورک، غیر موزوں سائز یا صفحے پر پھیلی ہوئی سیاہی کے باعث مقابلے میں نہ شامل ہو سکے۔ چند اچھے اور منتخب کارٹون ہم نے گذشتہ ماہ شائع کر دیئے تھے۔ یہاں ہم تاخیر سے موصول ہونے والے بعض دلچسپ کارٹون ایک بار پھر شائع کر رہے ہیں۔

رُقیہ آرزو ۔ کوئٹہ

نازیہ جبین ۔ اسلام آباد

قیصر محمود ۔ مانسہرہ

محمد سلمان (...)

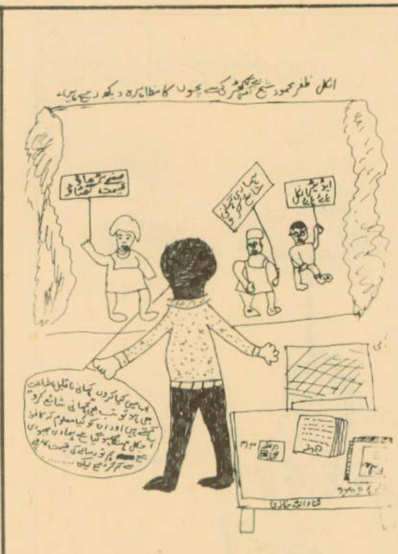

ثناء اللہ نیازی ۔ میر پور خاص

آدم خور شیر

سیّد عرفان علی یوسف

"میں تنہا رہ سکتی ہوں ڈیڈی" لڑکی نے کہا۔ وہ آرام کے کمرے میں ایک آرام دہ کرُسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ کرُسی کے گرَد پوش اپنا رنگ بدل چکے تھے اور ان پر بنے ہوئے گلاب کے خوبصورت ہوتے تھے۔ وہ اپنے باپ کی روانگی کے بارے میں سوچتے ہوئے ڈر رہی تھی۔ اس کا باپ مویشیوں کی خریداری کے لیے کئی سو میل دور جا رہا تھا۔ اس کے جانے کے بعد اُسے پورا ایک ہفتہ افریقہ کے اُس جنگل میں بنے ہوئے مکان میں تنہا رہنا تھا۔

"باربرا" لڑکی کے باپ نے کہا "اپنی حفاظت کے لیے تمہارے پاس بندوق اور کتّے موجود ہیں۔ اگر کوئی مسئلہ نہ پیدا ہوا تو میں ایک ہفتہ میں واپس آجاؤں گا۔ اگر کوئی خطرہ ہو تو تم کار کے ذریعے قریبی گاؤں جا سکتی ہو جو یہاں سے چار گھنٹہ کی ڈرائیو پر ہے۔" "بشرطیکہ کوئی طوفان نہ آجائے یا کار ٹھیک چلتی رہے" اس نے دِل میں سوچا۔

باپ اور بیٹی کچھ دیر گفتگو کرتے رہے۔ جان برٹن اپنی بیٹی کو ایک ہفتہ کے لیے تنہا اس کیمپ میں

چھوڑتے ہوئے خوفزدہ تھا، لیکن اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ کسی نہ کسی کو تو کیمپ کی دیکھ بھال کے لیے رُکنا ضروری تھا۔ اور اُسے ہر حال میں مویشی لانے تھے۔ اس کا ملازم بُوتھا ان مویشیوں کو لا رہا تھا کہ راستے میں بیمار پڑ گیا اور فوت ہو گیا۔

"اگر میں بہت تیزی سے کار چلاتا رہا تو مجھے وہاں پہنچنے میں دو دن لگ جائیں گے" اس کے باپ نے کہا۔

باربرا کی نظریں اپنے باپ کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں "ڈیڈی آپ بہت تھکے ہوئے لگتے ہیں" اس نے دل ہی دل میں کہا" لیکن اگر آپ یہ مویشی حفاظت سے لے آئے تو ہم انھیں بیچ کر بہت رقم کما سکیں گے اور ہماری پریشانیاں دُور ہو جائیں گی"

لیکن اس کے باوجود وہ تنہا نہیں رہنا چاہتی تھی۔ افریقہ کے اس غیر مہذّب خطے میں وقت بہت آہستہ گزرتا تھا اور یہاں اس ویرانے میں آٹھ دن گزارنا آٹھ ماہ کے برابر تھا" تم اب بائیس سال کی ہو چکی ہو" اس کے باپ نے کہا۔

"ڈیڈی آپ میرے لیے زیادہ پریشان نہ ہوں" باربرا بولی" میں بالکل ٹھیک اور مطمئن زندگی گزار رہی ہوں"

"میں روشنی پھیلنے سے پہلے نکل جانا چاہتا ہوں" اس کے باپ نے کہا۔

"میں صبح کا ناشتا اور دن کا کھانا تیار کر دُوں گی ڈیڈ" باربرا بولی۔

جب سورج طلوع ہو رہا تھا تو اس کا باپ روانہ ہو گیا۔ باربرا اُسے چار گھوڑوں کی گاڑی پر جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔

"واپسی میں وہ انہی میں سے ایک گھوڑے پر سوار ہو گا" باربرا نے سوچا" اور گاڑی کو اُس کے مویشی چرانے والے لڑکے چلا رہے ہوں گے"

وہ عرصہ سے اس فارم میں رہ رہی تھی اور یہ سب کچھ اُس کے لیے نیا نہیں تھا۔

ٹھنڈا سرمئی آسمان مشرق کی طرف سُرخ ہوتا جا رہا تھا۔ درختوں اور جھاڑیوں کی شکلیں مٹیالے اندھیرے میں اُترتی روشنی کی لہر میں نمایاں ہونے لگی تھیں۔ باربرا کے دونوں بڑے کتّے اس کے دائیں بائیں کھڑے تھے اور محبّت سے اپنا منہ اس کے کپڑوں پر رگڑ رہے تھے۔ اس نے کتّوں کے سر پر پیار سے ہاتھ رکھا اور مشرق کی طرف دیکھتی رہی یہاں تک کہ سورج نکل آیا۔

وہ واپس پلٹی۔ دونوں کتّے اس کے ساتھ ساتھ تھے۔ دروازے کے قریب وہ اپنے لگائے ہوئے

پودوں کی دیکھ بھال کرنے لگی۔ دیواروں پر اس کے باپ کے شکار کیے ہوئے بہت سے جانوروں کے سر لگے ہوئے تھے۔ دوسری جانب ایک بیس فٹ لمبے سانپ کی کھال لگی ہوئی تھی۔ اس کا باپ جوانی میں بہت بڑا شکاری رہ چکا تھا۔

باربرا نشست کے کمرے میں گئی۔ ہر چیز یہاں پرانی لیکن آرام دہ تھی۔ ان میں سے بعض چیزیں انگلستان میں اُس کے دادا سے تعلق رکھتی تھیں۔ فرش قالینوں اور شیر کی کھالوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ حالانکہ بعض کھالیں گل کر خراب ہو گئی تھیں لیکن اس کے باپ نے انھیں یہاں سے ہٹایا نہیں تھا۔ "یہ میری زندگی کا حصّہ ہیں بیٹی" اُس نے کہا تھا۔ "میں جانتا ہوں کہ یہ اب پُرانی ہو چکی ہیں اور پھٹنے کے قریب ہیں لیکن میں بھی تو پرانا ہو کر اب مرنے کے قریب ہوں۔ یہ کھالیں اُس زمانے سے تعلق رکھتی ہیں جب میں بالکل جوان تھا اور تمھاری ماں بھی زندہ تھی۔"

اس کے لیے باربرا کی ماں کا تذکرہ کچھ خوشگوار نہیں تھا۔ وہ اس سے بہت محبت کرتا تھا۔ "جب تمھاری ماں مری تو اُس کے ساتھ میرے جسم کا ایک حصّہ بھی ختم ہو گیا۔ اگر تم نہ ہوتیں تو میں بھی مر گیا ہوتا۔"

"نہیں ڈیڈی" باربرا بولی "کیا آپ خود کو ہلاک کر لیتے۔"

"نہیں ڈیئر" وہ بولا۔ "میں خودکشی نہیں کرتا لیکن زندہ رہنے کی اُمنگ میرے اندر ختم ہو جاتی۔ زندہ رہنا اُن دنوں بڑا دشوار تھا۔ افریقہ میں اتنی وبائیں پھیلتی تھیں کہ آدمی کو اپنی نگہداشت کرنا پڑتی تھی۔ جو اپنا خیال نہیں رکھتا تھا وہ جلد ہی مرجاتا تھا۔ بیماریاں، افریقی حملہ آور اور جنگلی درندے ہر ایک کو ہلاک کر دیتے تھے۔ لیکن اس سے بھی زیادہ آدمی کی موت یہ تھی کہ وہ اپنا خیال رکھنا چھوڑ دے۔ نہ نہائے، نہ شیو بنائے اور نہ نئے صاف ستھرے کپڑے پہنے۔ یہ چیز آدمی کو تباہ کر دیتی ہے۔ آدمی اپنی صفائی اور صحت کا خیال نہ رکھے اور بیماری کا اس پر حملہ ہو جائے تو پھر وہ بیماری کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔"

باربرا اب یہ بات سمجھی تھی کہ اس کا باپ افریقہ کے اس حصّے میں جہاں کوئی پڑھا لکھا آدمی کئی سو میل دُور تھا روزانہ کپڑے کیوں تبدیل کرتا تھا اور شیو بناتا تھا۔ ہر صبح باربرا کے بالوں میں کنگھا کرتا تھا۔ اس نے باربرا کی ماں کے مرنے کے بعد اُسے ماں بن کر پالا تھا۔ جب اُس کی ماں مری تھی تو اُس کی عمر صرف چھ سال تھی اور قریب ترین شہر یہاں سے تین سو میل دُور تھا۔ اس کے باپ نے اُسے پوری طرح پڑھایا لکھایا تھا۔ اس کا واحد مددگار ایک بوڑھا افریقی جم تھا۔

باربرا نے ماضی کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیا۔ اور کھانے کے کمرے میں چلی گئی۔ ناشتے کے گندے برتن میز پر پڑے ہوئے تھے وہ انھیں میز سے اُٹھانا نہیں چاہتی تھی۔ کیونکہ ان کی موجودگی سے اُسے یہ

احساس ہوتا تھا کہ اس کا باپ یہیں موجود ہے اور وہ تنہا نہیں ہے۔ اُس نے گندے برتن میز سے اُٹھا کر فرش پر رکھ دیے۔ اور جم کو آواز دینے لگی۔ جم ان کا پُرانا افریقی ملازم تھا۔ جم آیا تو اُس نے کہا "جم میرے لیے چائے لے آؤ" جم باورچی خانے میں چلا گیا۔ اور وہ اُس کے پیروں کی چاپ کچن کے فرش پر سنتی رہی۔

جب اُس نے چائے پی لی تو اپنے روزمرّہ کے کاموں میں مصروف ہوگئی۔ اس کی مرغیوں میں سے بعض انڈوں پر بیٹھی تھیں اور ان انڈوں میں سے آئندہ چند دن میں چُوزے نکلنے والے تھے۔ اس نے پودوں کو پانی دیا۔ مالی لڑکوں کو کام بتایا۔ اس کے بعد گھوڑے پر سوار ہوکر کیمپ کی دیوار کا معائنہ کیا اور دیکھا کہ دروازے بند ہیں یا نہیں۔ پورا دن جلد ہی گزر گیا، لیکن یہ اس کا پہلا تنہا دن تھا اور اُسے اپنے باپ کی واپسی کا پورے سات دن انتظار کرنا تھا۔ وہ کیمپ فائر کے پاس بیٹھ گئی اور چائے پینے لگی۔ اُسے اپنے ڈیڈی بہت یاد آرہے تھے۔ شاید وہ بھی اس کے بارے میں سوچ رہے ہوں۔ شاید وہ یہ سوچ رہے ہوں کہ ہم اپنے تمام مویشی فروخت کرنے کے بعد ایک سال کے لیے یہ کیمپ بند کردیں گے اور سیاحت کے لیے نکل جائیں گے۔

آج بہت گرمی تھی۔ اس نے دُعا کی کہ کوئی طوفان نہ آئے کیونکہ ڈیڈی کی گاڑی پر ایک ہلکا سا غلاف چڑھا ہوا تھا۔ جو تیز بارش اور ہوا کا مقابلہ نہیں کرسکتا تھا۔ اس نے چائے کا خالی کپ نیچے دیوار کے ساتھ رکھا اور بندوق میں کارتوس لگانے لگی۔ کارتوس لگانے کے بعد اُس نے بندوق میز پر رکھ دی۔ وہ زیادہ پریشان نہیں تھی۔ اس کا نشانہ بہت اچھا تھا لیکن اس نے آج تک کسی زندہ چیز کو نشانہ نہیں بنایا تھا۔ اس کی خواب گاہ میں ایک پستول بھی تھا لیکن وہ پستول چلانا پسند نہیں کرتی تھی کیونکہ پستول ہمیشہ کسی نہ کسی آدمی کو مارنے کے لیے استعمال ہوتے تھے اور اس کے لیے یہ مشکل تھا کہ وہ کسی زندہ آدمی پر گولی چلا سکے۔

آئندہ دو دن تیزی سے گزر گئے لیکن یہ تیسرا۔۔۔ دن گزشتہ دو دنوں سے مختلف تھا۔ کتّوں نے ایک لمحے کے لیے بھی اس کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ وہ جہاں بھی جاتی کتّے چوکیدار کی طرح اس کے ساتھ ساتھ جاتے۔ وہ جہاں بھی بیٹھ جاتی وہ بھی بیٹھ جاتے۔ وہ اپنا سر محبّت سے اُس کی گود میں رگڑتے اور پھر اس کو پیار سے دیکھنے لگتے "پریشانی کی تو کوئی بات نہیں" اُس نے خود سے کہا "ہر چیز ٹھیک ٹھاک ہے۔"

بوڑھا جم دوپہر تک گھر میں رہا۔ وہ کسی ماں کی طرح اس کی دیکھ بھال کرتا رہا۔ وہ اس کے ڈیڈی کا اس وقت سے خدمت گار تھا جب وہ پیدا بھی نہیں ہوئی تھی۔ وہ بعض اوقات اس کی ماں کا تذکرہ کرتا

کہ وہ کتنی اچھی تھی۔ بعض اوقات وہ جنگلی درندوں کا تذکرہ کرتا جو یہاں پائے جاتے تھے۔ جب اس کے ڈیڈی نے یہ فارم قائم کیا تو یہاں شیر بھی تھے۔ لیکن اب قریب ترین شیر بھی یہاں سے دو سو میل دُور تھا۔ "اگر تم شیر دیکھنا چاہتی ہو تو تمہیں پارک جانا پڑے گا۔" جم نے کہا۔

"میں پارک میں ایک دفعہ شیر دیکھ چکی ہوں۔" باربرا بولی۔ "وہاں شیر اس طرح رہتے ہیں جس طرح جنگل میں۔"

"ایسا بھی نہیں ہے۔" بوڑھے جم نے کہا۔ "اب وہاں اتنے شیر نہیں ہیں جتنے کہ پہلے تھے۔ یہ آزاد نہیں ہیں اور نہ ہی ٹھیک طرح سے شکار کر سکتے ہیں۔ جب تمہارے ڈیڈی اور میں جوان تھے تو یہ دُنیا بڑی خوبصورت تھی۔ ہر ایک آزاد تھا۔ انسان بھی اور جانور بھی اور اس وقت یہاں پولیس بھی نہیں ہوتی تھی۔" وہ بہت دیر تک بوڑھے جم کے ساتھ باتیں کرتی رہی۔ یہاں تک کہ سورج مغرب میں اُتر گیا۔ جب شام ہوئی تو بوڑھا جم اپنے گھر چلا گیا۔ وہ فارم کے ایک گوشے میں تنہا ایک چھوٹے سے جھونپڑے میں رہتا تھا۔ اس کے جانے کے بعد باربرا پھر پریشان ہو گئی۔ اُسے تنہائی سے خوف آنے لگا۔ اس نے بندوق اُٹھا کر اپنی گود میں رکھ لی۔ بندوق اُٹھا کر اُسے تھوڑا سا اطمینان ہوا۔ بندوق بھری ہوئی تھی اور فائر کرنے کے لیے بالکل تیار تھی۔ کتّے بھی اس کے دائیں اور بائیں بیٹھے اس کو دیکھ رہے تھے۔ "میں کس قدر احمق ہوں۔" اس نے اپنے بارے میں سوچا۔ "ڈیڈی صحیح کہتے ہیں مجھے واقعی اب شادی کر لینی چاہیے۔"

اس نے لیمپ اُٹھایا اور اپنی خواب گاہ کی طرف چلی۔ کتّے اس کے ساتھ ساتھ تھے۔ وہ رات کو کبھی گھر میں تالا نہیں لگاتی تھی۔ اور اس وقت بھی محض اس وجہ سے گھر میں تالا لگانے کے لیے تیار نہیں تھی کہ وہ تنہا ہے۔ اس نے بندوق اپنے بستر کے برابر رکھ لی۔ "یہ سب تمہارا قصور ہے۔" اس نے کتّوں سے کہا۔ "تم لوگ مجھے ڈرا رہے ہو۔" کتّے خاموشی سے بیٹھے رہے۔ وہ خوش نظر نہیں آتے تھے۔ وہ کھڑکی سے باہر اندھیرے میں گھُور رہے تھے۔ "یہ میرا خیال رکھتے ہیں اور مجھے احساس دلا رہے ہیں کہ میں تنہا نہیں ہوں۔" اُس نے سوچا

وہ بستر میں لیٹ گئی اور کتاب اُٹھا کر پڑھنے لگی لیکن اس کا دل پڑھنے میں نہیں لگ رہا تھا۔ "کہیں کچھ نہ کچھ گڑبڑ ضرور ہے۔" وہ دل ہی دل میں سوچ رہی تھی۔

"لیکن کیا گڑبڑ ہے؟" وہ فیصلہ نہیں کر پائی۔ یہ سب کتّوں کی عجیب و غریب حرکات کی وجہ سے تھا۔ وہ جب بھی بستر میں سونے کے لیے لیٹتی تھی۔ دونوں کتے بھی نیچے فرش پر لیٹ کر سو جاتے تھے لیکن آج ان میں سے ایک کتا کھڑکی کے پاس بیٹھا مسلسل اندھیرے میں گھُور رہا تھا۔ اس کے کان کھڑے ہوئے

تھے اور وہ مسلسل جنگل کی طرف آنے والی آوازیں سُننے کی کوشش کر رہا تھا۔ دوسرا کتا نیچے فرش پر لیٹا ہُوا تھا۔ اس نے اپنی ناک اگلے پنجوں پر رکھی ہوئی تھی لیکن اس کے کان بھی کھڑے ہوئے تھے۔ وہ مسلسل اپنے دوسرے بھائی پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔

"کیا بات ہے ؟" اس نے کتّوں سے مخاطب ہو کر کہا۔

کتّوں نے محبّت سے اپنی دُم ہلائی اور دوبارہ کھڑکی سے باہر گھُورنے اور جنگل سے آنے والی آوازوں کو سُننے میں مصروف ہو گئے۔

باربرا نے اسپرین کی ایک گولی لی اور دوبارہ کتاب پڑھنے لگی۔ وہ رات ایک بجے تک جاگتی رہی اس دوران کتّے بھی جاگتے رہے، لیکن انھوں نے اپنی جگہیں تبدیل کر لی تھیں۔ اب دوسرا کتّا کھڑکی پر بیٹھا پہرہ دے رہا تھا اور پہلا فرش پر بیٹھا ہُوا تھا۔

باربرا کی آنکھ رات کے دو بجے لگی ۔۔۔ رات میں دو مرتبہ وہ جاگی اور اُس نے ہر مرتبہ کتّوں کو مسلسل کھڑکی پر بیٹھے اور پہرہ دیتے ہوئے پایا۔ چاند پوری طرح نکلا ہُوا تھا اور اس کی چاندنی میں جنگل بے حد پُراسرار لگ رہا تھا۔ "شاید یہ چاند ہے" اس نے سوچا "جس سے انسان اور کتّے دونوں ہی متاثر ہوتے ہیں"

وہ جانتی تھی کہ تھوڑی دیر میں صبح ہو جائے گی۔ بوڑھا جم باورچی خانے میں ملے گا۔ وہ اُسے چائے کے ایک کپ کے لیے آواز دے گی۔ وہ باورچی خانے میں زور زور سے برتن رکھتا تھا جس سے اکثر اس کی آنکھ کھل جاتی تھی۔ وہ صبح جلدی آتا تھا۔ اور شور مچاتے ہوئے کام کرتا تھا۔ اُس نے ایک مرتبہ پھر کتّوں کو اندھیرے میں گھورتے ہوئے دیکھا اور بولی "احمقو! تمھیں پتہ نہیں کیا ہو گیا ہے۔ خود بھی جاگ رہے ہو اور مجھے بھی ڈرا رہے ہو" اس کے بعد پھر اُسے نیند آ گئی۔

جب اُس کی آنکھ کھُلی تو نو بج چکے تھے۔ دونوں کتّے نیچے بیٹھے ہوئے تھے وہ اُچھل کر بیٹھ گئی اور بولی "چائے کہاں ہے۔ جم کہاں ہے؟"

وہ کُود کر بستر سے باہر نکلی اور اپنا کوٹ پہننے لگی۔ باورچی خانے میں بالکل خاموشی تھی اور کسی قسم کی آواز سُنائی نہیں دے رہی تھی۔ جم وہاں نہیں تھا۔ چولھے میں آگ نہیں جل رہی تھی۔ لیمپ اُسی طرح میز پر رکھا ہوا تھا۔ وہ جم کی جھونپڑی کی طرف بڑھی۔ کتّے اُس کے ساتھ ساتھ تھے اور ان کا رویّہ بے حد عجیب تھا۔ وہ زمین کو سُونگھ رہے تھے۔ اور مسلسل غرّا رہے تھے۔ کوئی نہ کوئی گڑبڑ ہو چکی تھی۔ وہ جھونپڑی کے قریب گئی۔ جھونپڑی کا دروازہ کھُلا ہُوا تھا۔ کتّے دروازے میں بیٹھ کر غرّا ۔۔۔ رہے تھے۔ ان کے بال کھڑے ہوئے تھے اور دُم تنی ہوئی تھی۔ وہ اندر گئی۔ جم بستر پر نہیں تھا، لیکن وہ

رات سویا ضرور تھا کیونکہ بستر پر اُس کے لیٹنے کے آثار نمایاں تھے ۔ اس کی سُرخ چادر فرش پر پڑی تھی ۔ جھونپڑی میں عجیب سی خوشبو پھیلی ہوئی تھی ۔ تیز بلّی جیسی خوشبو ۔ اسی خوشبو نے کتّوں کو غُرّانے پر مجبور کر دیا تھا ۔ اس کے دماغ میں فوراً ایک خیال آیا ، لیکن اُس نے خود ہی اس خیال کو رَد کر دیا ۔ وہ جھونپڑی سے باہر نکلی ۔ پھر اُس نے باہر مٹّی میں اُن نشانات کو دیکھ لیا ۔ یہ شیر کے پنجوں کے نشان تھے ۔ شیر جم کے جسم کو کھینچتا ہوا فصل کے درمیان سے گزرا تھا ۔ کتّے بھونکتے ہوئے آگے آگے چل رہے تھے ۔ اور بار بار زمین کو سُونگھ رہے تھے ۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ساری رات جاگتے رہے انھیں باہر شیر کی موجودگی کا احساس ہو چکا تھا اسی لیے انھوں نے ساری رات کھڑکی پر بیٹھ کر پہرہ دیا تھا ۔ یہ شیر یقیناً بہت بڑا تھا اور رات کو بہت خاموشی سے آیا تھا ۔

باربرا کو اپنے گھٹنے کمزور محسوس ہونے لگے ۔ اس نے شیر کے پنجوں کے ایک نشان کو چھُوا ۔ یہ زیادہ سے زیادہ تین یا چار گھنٹے پُرانا تھا ۔ نشانوں پر خون کی سُرخی بھی تھی ۔ کل ہی تو اُس نے بوڑھے جم کو اپنے باغ میں کام کرتے ہوئے دیکھا تھا ۔ وہ یہاں سبزیاں اُگا رہا تھا ۔" مجھے بالکل خوفزدہ نہیں ہونا چاہیئے "۔ اس نے سوچا ۔ اُس نے کتّوں کو آواز دے کر روکا اور اپنی آنکھیں خشک کرنے لگی " جم ڈیئر ۔۔۔ اوہ جم " اس نے دُکھ سے کہا وہ اس سے اسی طرح محبّت کرتی تھی جس طرح اپنے ڈیڈی سے پیار کرتی تھی ۔ اُسے یاد آیا ۔ وہ دونوں رات ہی تو شیروں کے بارے میں باتیں کر رہے تھے ۔ جم نے کہا تھا کہ قریب ترین شیر بھی یہاں سے دو سو میل دُور ہے ۔

اُس نے یاد کرنا شروع کیا کہ اُس کے ڈیڈی نے اُسے شیروں کے بارے میں کیا بتایا تھا ۔ پہلی بات تو قطعی طے شُدہ تھی کہ بوڑھا جم اب اس دنیا میں نہیں تھا ۔ اگر کسی آدمی کو شیر اُٹھا کر لے جائے تو پھر اُس کے بچنے کا ایک فیصد امکان بھی نہیں رہتا ۔ اس لیے اب کسی فوری قدم کی ضرورت نہیں تھی ۔ اس نے کمرے میں جا کر آہستہ آہستہ اپنا لباس تبدیل کیا ۔ ایک بات واضح تھی کہ یہ شیر آدم خور تھا اور اُسے ہلاک کرنا ضروری تھا ۔

اُس نے سوچا کہ اُسے کار نکالنی چاہیئے ۔ اور مدد کے لیے قریبی گاؤں تک جانا چاہیے ۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی اس کے ساتھ آنے کے لیے تیار ہو جائے ، لیکن کون اس کے ساتھ آئے گا ۔ شہر میں صرف دو پولیس والے تھے لیکن ان کے پاس فوجی بندوقیں تھیں ۔ بہت سے لوگ اپنی بہادری کے قصّے بیان کرتے تھے لیکن قصّے بیان کرنے اور حقیقت میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے ۔ ان میں سے شاید ہی کوئی کسی آدم خور شیر کا مقابلہ کرنے کے لیے آمادہ ہوتا ۔ وہ یقیناً اس قسم کے عذر پیش کرتے " میری بیوی مجھے نہیں جانے دیتی " " میں آج نہیں جا سکتا " " میں اگر چند سال جوان ہوتا " وہ اس قسم کے عذر پہلے بھی سُن چکی تھی ۔ نہیں گاؤں جانے

کا کوئی فائدہ نہیں. گاؤں میں صرف کاشتکار تھے جو کسی کام کے نہیں تھے ۔ وینٹر بالکل بوڑھا تھا۔ لیبوس نکما تھا سیمننگ کو بندوق پکڑنی ہی نہیں آتی تھی ۔ گویا کوئی بھی آدمی اس کے کام نہیں آسکتا تھا ۔

وہ خاموشی سے اُٹھی اور باورچی خانے میں چلی گئی "چائے کا ایک گرم کپ مجھے صحیح فیصلہ کرنے پر تیار کر سکے گا" اس نے چائے کے دو کپ پیے اور پھر فیصلے پر پہنچ گئی ۔ اس سوال کا صرف ایک ہی جواب تھا ۔ اسے خود ہی اس آدم خور شیر کو مارنے کے لیے نکلنا پڑے گا ۔ وہ جانتی تھی کہ اس کے ڈیڈی یہاں ہوتے تو خود شیر کو مارنے کے لیے نکلتے ۔

اُس نے اپنی بندوق اُٹھائی اور گھر سے باہر نکل آئی اور پچھلے دروازے پر لگی ہوئی گھنٹی بجادی ۔ یہ گھنٹی ہمیشہ اُس وقت بجائی جاتی تھی جب کوئی خطرے کی بات ہوتی تھی ۔ بہت سارے آدمی دوڑتے ہوئے اُس کی طرف آئے ۔ دس منٹ میں اُس کے سب ملازم وہاں جمع ہو گئے ۔ ان کے ساتھ ان کی بیویاں اور بچے بھی تھے ۔ وہ اُنھیں جم کی جھونپڑی تک لے گئی ۔ ایک لمحے تک وہ خاموش رہے پھر اپنی زبان میں چلائے "لیئو، لیئو" اور پھر انھوں نے شیر کے پنجوں کے نشانوں کی طرف اشارہ کیا ۔ باربرا انھیں زور زور سے باتیں کرتے دیکھتی رہی پھر اس نے اُنھیں خاموش ہونے کا اشارہ کیا "جم میرا ملازم اور میرا دوست تھا" اس نے کہا "وہ میرے ڈیڈی کا بھی دوست تھا میں اُسے ڈھونڈنے جارہی ہوں ۔"

"تمھیں اپنے ڈیڈی کے آنے کا انتظار کرنا چاہیئے ۔" بوڑھے ایموس نے کہا ۔

"نہیں" باربرا بولی "میں انتظار نہیں کر سکتی ۔ میں جارہی ہوں ۔ تم سب لوگ ڈھول اور ڈبے لے کر آؤ ۔ اس کے علاوہ اپنے تمام نیزے اور کتّے وغیرہ بھی لے آؤ ۔"

"لیکن تم جانتی ہو کہ ہمارے پاس نیزے نہیں ہیں ۔ پولیس نے نیزے رکھنے پر پابندی لگا رکھی ہے ۔" ایک آدمی بولا ۔

"نیزے تم سب لوگوں کے پاس ہیں" وہ بولی "مجھے معلوم ہے کہ تم یہ نیزے اپنی جھونپڑیوں کی چھتوں میں چُھپا کر رکھتے ہو ۔" وہ آدمی ہنس دیا ۔

آدھے گھنٹے کے اندر وہ سب تیار تھے ۔ ان کی تعداد ۱۲ تھی ۔ جن کے پاس نیزے، کمانیں، تیر، کلہاڑے اور چاقو تھے ۔ بعض لوگ ڈھول اور ڈبّے اُٹھائے ہوئے تھے ۔

"ایموس" باربرا نے بوڑھے افریقی سے کہا "شیر کے پنجوں کے نشانوں کو تلاش کرنے کے لیے بہترین شکاری کا انتخاب کرو ۔" اس نے دو آدمیوں کو آواز دی ۔ ان میں سے ہر ایک اپنے جسم پر صرف لنگوٹ باندھے ہوئے تھا اور ان کے پاس تیر اور کمان تھے ۔

اُسے ہر چیز عجیب اور غیر حقیقی لگ رہی تھی ۔شیر کی بُو نے اس پر غیر معمولی اثر کیا تھا ۔ وہ جم کی زندگی کے لیے اپنی زندگی دینے کو تیاّر تھی ۔ اس نے اس سے پہلے ایسا کبھی محسوس نہیں کیا تھا ۔ ایک گھنٹہ پہلے تو وہ ایک ماڈرن عورت تھی لیکن اب وہ خود کو بھی افریقی عورت ہی محسوس کر رہی تھی ۔ وہ ایک دم دو ہزار سال پیچھے لوٹ گئی تھی ۔

ریتیلی زمین میں شیر کے پنجوں کے نشانات دیکھتے ہوئے چلنا زیادہ دشوار نہیں تھا ۔شیر نے ابتدا میں جم کو اگلی ٹانگوں سے پکڑ کر گھسیٹا تھا ۔ پھر بعد میں اُس نے اُسے کمر سے پکڑ لیا تھا ۔ وہ سب ایک گھنٹے تک چلتے رہے ۔ یہاں تک کہ جنگلی چیونٹیوں کے ایک گھروندے کے پاس پہنچے ۔ شیر نے یہاں رُک کر اپنا شکار کھایا تھا ۔ دو گدھ بھی ایک درخت پر بیٹھے ہوئے تھے ۔ ایک میل مزید چلنے کے بعد وہ ایک جوہڑ تک پہنچے ۔ یہاں شیر پانی پینے کے لیے رُکا تھا ۔

"شیر یہیں کہیں سو رہا ہوگا " بوڑھے ایموس نے کہا "مجھے یقین ہے کہ وہ سامنے جھاڑیوں میں آرام کر رہا ہوگا " ایموس نے کوئی تین سو میٹر کے فاصلے پر گھنی جھاڑیوں کی طرف اشارہ کیا ۔ "اسے یہاں سے دُور جانے کی کیا ضرورت ہے ۔ یہاں سایہ بھی ہے اور پانی بھی قریب ہے "

وہ پنجوں کے نشانات کو دیکھتے ہوئے آگے بڑھے ۔کھوجی شکاریوں نے جھاڑیوں کے گرد ایک چکرّ لگایا پھر اطلاع دی کہ شیر جھاڑیوں کے اندر ہی ہے ۔کیونکہ پنجوں کا کوئی نشان باہر کی جانب نہیں جا رہا ۔

ہَوا ان کے پیچھے سے شیر کی جانب چل رہی تھی اور وہ شیر کو دھوکے میں نہیں رکھ سکتے تھے ۔ باربرا نے ایموس سے کہا " میں تم کو بتاتی ہوں کہ میں کیا کرنا چاہتی ہوں ۔ میں چیونٹیوں کے گھروندے کے پیچھے چھُپ جاتی ہوں ۔ یہ گھروندہ ایک آدمی کے قد سے زیادہ اونچا ہے ۔ جب میں وہاں پہنچ جاؤں تو تم لوگ زور زور سے ڈھول بجاؤ گے اور کنستر بجاؤ گے اور کتوں کو جھاڑیوں کے اندر چھوڑ دو گے ۔ اس طرح شیر میری طرف توجہ نہیں دے سکے گا ۔ پھر تم چند آدمیوں کو گروپ کی شکل میں دونوں طرف جھاڑیوں میں بھیجو اور اپنے سامنے کی جھاڑیوں میں آگ لگا دو "

باربرا آہستہ آہستہ چیونٹیوں کے گھروندے کی طرف بڑھی ۔ وہ سیدھی اس طرف نہیں گئی تاکہ شیر اُسے دیکھنے نہ پائے ۔ اس نے اس مقصد کے لیے لمبا راستہ اختیار کیا ۔ افریقی مل کر ڈھول اور کنستر بجا رہے تھے ۔ اس لیے اُسے یقین تھا کہ شیر نے اُسے نہیں دیکھا ہوگا ۔ وہ اُسے اُس وقت تک نہیں سُونگھ سکتا تھا جب تک کہ ہَوا کا رُخ تبدیل نہ ہو جائے اور نہ ہی وہ اُسے گھروندے کے پیچھے دیکھ سکتا تھا ۔

جُونہی وہ گھروندے کے پیچھے پہنچی، افریقیوں نے جھاڑیوں میں آگ لگا دی۔ کتے بُری طرح بھونک رہے تھے۔ افریقیوں کی آوازیں بلند سے بلند تر ہوتی جا رہی تھیں۔ ڈھول کی آواز تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی تھی۔ یہ آواز کسی بھی جانور کو خوفزدہ کرنے کے لیے کافی تھی۔ جھاڑیوں میں آگ تیزی سے پھیل رہی تھی۔ اور اس کا دُھواں اندر جا رہا تھا۔ دھوپ میں نیزوں کی انّیاں چمک رہی تھیں۔ افریقی آگ کی طرف تھے اس لیے محفوظ تھے۔ شیر دوسری جانب سے جھاڑیوں سے باہر نکلا۔

جنگل کا بادشاہ اپنے آرام میں خلل ڈالے جانے پر بے حد غصّے میں تھا۔ اُس کی دُم ہَوا میں تیزی سے گھوم رہی تھی۔ پھر وہ رُکا۔ اُس نے اپنا سر نیچے کیا اور پوری قوّت سے دھاڑا۔ وہ مسلسل گرج رہا تھا۔

"میں نے اس سے پہلے کوئی شیر نہیں مارا" باربرا نے سوچا۔ "میرے جیسے لوگ شیر کا شکار نہیں کر سکتے۔"

اُسی وقت اُسے بوڑھے جم کا خیال آیا اور اس کا خوف دُور ہو گیا۔ "میں تجھے ہلاک کر دُوں گی۔" اُس نے سوچا۔ شیر اُس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ یہ اس کھیل کا سب سے مشکل حصّہ تھا۔ وہ اُسی طرح خاموش کھڑی رہی اور شیر سیدھا اُس کی طرف بڑھتا رہا۔ اُس نے اپنی بندوق کی نال گھروندے پر رکھی ہوئی تھی۔ وہ شیر کے قریب آنے کا انتظار کرتی رہی۔ یہاں تک کہ وہ ۲۵ میٹر کے فاصلے پر آ گیا۔ اس نے لبلبی دبا دی۔

پہلی ہی گولی سے شیر نیچے گر گیا۔ اس کے گرنے سے مٹّی کا بادل ہوا میں بلند ہُوا۔ وہ پوری طاقت سے گرج رہا تھا۔ باربرا نے بندوق میں دوسرا کارتوس لگایا اور دو اور گولیاں شیر کے جسم میں اُتار دیں۔ افریقیوں نے اپنے کتّوں کو آزاد چھوڑ دیا اور وہ مرتے ہوئے شیر پر حملہ کرنے لگے۔

باربرا وہیں بیٹھ گئی۔ اس نے اس سے پہلے تین گولیاں ایک ساتھ کبھی نہیں چلائی تھیں۔ بندوق کے دھکّے سے اُسے خود بھی چوٹ لگی تھی۔ شیر مٹّی میں لوٹتے ہوئے پوری قوّت سے دھاڑ رہا تھا۔ افریقی شور مچا رہے تھے اور کُتّے بھونک رہے تھے۔ بوڑھا ایموس اس کے قریب آیا۔ "جم کہاں ہے؟" اُس نے پوچھا۔

"میں آپ کو دکھاؤں گا" وہ بولا۔ "وہ کچھ اچھی حالت میں نہیں۔ شیر اُس کا آدھا حصّہ کھا چکا ہے۔ صرف سر اور آدھا جسم بچا ہے۔" اس نے افریقی ملازموں کو زور سے آواز دی۔ "اے ... اے ... ای ... اے ... ای ای۔ ہم ایسی عورت کے ملازم ہیں جو ایک آدمی سے زیادہ بہادر ہے۔ ہم بہت خوش ہیں۔"

انھوں نے جم کی لاش کو کپڑے سے ڈھک دیا۔ اور اسے لکڑیوں کے بنے ہوئے اسٹریچر پر

ڈال دیا۔ شیر مر چکا تھا۔ اس کے پیر بھی لکڑیوں سے باندھ دیے گئے۔ اسی وقت باربرا نے کسی کو انگریزی میں کہتے ہوئے سُنا۔

"کس نے شیر کو ہلاک کیا ہے؟"

باربرا مُڑی تو اُس نے بھورے کپڑوں میں ملبوس ایک نوجوان آدمی کو دیکھا۔ وہ ایک چوڑا بھورا ہیٹ پہنے ہوئے تھا اور ایک بندوق اس کے شانے سے لٹک رہی تھی۔

"کیا تم پارک آفیسر ہو؟" باربرا نے پوچھا۔

"ہاں، میں کارل بریمر ہوں" وہ بولا۔

"تم یہاں کیا کر رہے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"میں دس دن سے اس آدم خور کا پیچھا کر رہا ہوں۔ یہ چار آدمیوں کو ہلاک کر چکا ہے۔"

"اس نے میرے ملازم کو کل رات ہلاک کر دیا" باربرا بولی۔ "جم میرا ملازم ہی نہیں تھا، میرا دوست بھی تھا۔ اس نے مجھے اپنی گود میں کھلایا تھا۔" وہ اچانک پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"آؤ گھر چلیں" کارل بریمر نے کہا۔

"کیا میں تمھارے گھر غسل کر سکتا ہوں؟"

"کیوں نہیں" باربرا بولی۔

"میں گزشتہ دس دن سے نہایا نہیں ہوں"۔ وہ بولا۔

"تم ڈیڈی کے آنے تک ہمارے ساتھ ٹھہر سکتے ہو۔ وہ تم سے مل کر بہت خوش ہوں گے" باربرا نے کہا۔

"میں تمھارے ڈیڈی کا انتظار کروں گا۔ مجھے اپنی رپورٹ بھی لکھنی ہے۔ تمھیں اب ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں" بریمر نے کہا۔

باربرا کار میں بیٹھ گئی۔ اس کا خوف دُور ہو گیا تھا۔ جو گزشتہ کئی دن سے اسے گھیرے ہوئے تھا۔

ذیشان بن صفدر

صبا اور پنکی

ایک معصوم بلی کی کہانی

"امی یہ کیا اُٹھا لائیں": پنکی نے منہ بنا کر ناک میں منمناتے ہوئے بیزاری سے کہا۔

امی نے پائیدان کے قریب اپنی سینڈلیں اُتاریں۔ پرس کو میز پر رکھا اور خود صوفے پر نیم دراز ہوتے ہوئے بولیں: "میں کیا کرتی۔ یاسمین کی دونوں بیٹیاں ضد کرنے لگیں کہ آنٹی آپ اسے لے جائیے"۔

"لیکن امی، یہاں پہلے بھی تو کئی بلیاں ہیں۔ بلیکی... رانی، ملکہ اور کیتھی۔ اب اسے کہاں رکھیں گی...؟" پنکی نے پہلے کی ہی طرح بیزاری سے پوچھا۔

"ارے بیٹی! کیوں خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہو۔ جہاں اتنی پل رہی ہیں یہ بے چاری بھی پل جائے گی"۔

امی ایک بار کرنے کی جو ٹھان لیں وہ کر کے ہی رہتی ہیں۔ اور بلیوں سے تو انہیں عشق تھا۔ بلی کتنا ہی بڑا نقصان کیوں نہ کر ڈالے وہ کچھ نہیں کہتی تھیں۔ اور اگر کوئی ان کے سامنے بلیوں کو برا کہہ دے تو پھر اُس کی خیر نہیں۔ جانوروں سے پیار کرنے کی حدیثیں سُنانے لگتیں۔ بے زبان جانوروں کی آہ سے ڈراتیں۔ اُن کی ان عادتوں کا پنکی کو بخوبی علم تھا۔ ملکہ کو بھی وہ بازار سے گھر لوٹتے ہوئے سڑک پر سے اُٹھا کر لائی تھیں۔ رانی انہیں شادی کی سالگرہ کے تحفے میں ملی تھی۔ یہ ایک ایرانی بلی تھی۔ اور کیتھی انڈونیشیا سے انکل کے ساتھ آئی تھی۔ رہ گئی بلیکی۔ وہ نہ جانے کہاں سے آئی۔

اور یہاں اپنی ہم جنسوں کو موج اُڑاتے دیکھ کر خود بھی آباد ہو گئی۔

ویسے ملکہ سب کی دلاری تھی۔ وہ تھی بھی بہت خوبصورت اور پیاری پیاری عادتوں والی۔ اب ایک اور نئی کا اضافہ تھا۔ بالکل ہی مرگلا، بلبلی بچّہ سا، آنکھیں بھی پوری طرح نہیں کھلی تھیں۔ رنگ بھی عجب بدنما سا تھا، بھُورا، بھُورا اور کالے کالے دھبّوں والا۔ نہ ہی سیالی بلّی جیسا رُعب، نہ انڈونیشین بلّی جیسی نزاکت اور نہ ہی رانی جیسا حسُن۔ نہ جانے کس نسل کی بلّی کا بچّہ تھا یہ۔ پنکی کو تو بالکل ہی پسند نہ آیا۔ اور یہی ناپسندیدگی شاید اُس کی مخالفت کا سبب تھی۔ اُس نے دِل ہی دِل میں یہ بھی سوچا کہ نہ جانے اس کی خالہ زاد بہنوں عباب اور نازش کو اس بچّے میں کیا نظر آیا تھا کہ ضد کر کے اس کی امی کے ساتھ کر دیا پنکی نے پہلی بار اس کی طرف غور سے دیکھا تو وہ بچّہ بھی اُس وقت اس کو دیکھ رہا تھا۔ اُس نے بڑی آہستگی سے اپنی دُم کا پرچم لہرایا۔ گویا اُس سے کہہ رہا ہو کہ میں تمہاری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتا ہوں۔ پنکی نے فوراً ہی اپنا منہ پھیر لیا۔ پھر بڑی بے دلی سے پوچھا "امی! آپ نے اس کا نام کیا سوچا ہے؟"

"صبا" انہوں نے ہلکے سے اپنا ہاتھ اُس کے جسم پر پھیرتے ہوئے کہا۔ "صبا!" پنکی نے اس بُری طرح چونک کر پوچھا۔ گویا اُس نے بجلی کے ننگے تاروں کو چھو لیا ہو۔ اور سوالیہ نگاہوں سے امی کو دیکھنے لگی: "کیا ہوا... بیٹی نام ہی تو ہے۔" امی نے بڑی نرمی سے سمجھایا۔

ہونہہ... اتنا خوبصورت اور نازک سا نام... اور اس بدشکل سے بلّی کے بچّے کا... پھر وہ غصّے اور ناراضگی کے اظہار میں اپنے پیر پٹختی ہوئی وہاں سے اپنے بیڈروم میں چلی گئی۔

صبا جلد ہی اس نئے خاندان میں گھُل مل گئی۔ گھر میں پہلے سے موجود دوسری بلّیوں نے بھی اسے اپنا نیا فیملی ممبر سمجھ کر قبول کر لیا۔ رانی کے تینوں بچّے حالانکہ اُس سے بڑے تھے۔ مگر مل کر کھیلتے رہتے۔ خود رانی نے کبھی اپنے بچوں کو اس سے الگ رکھنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ اپنے بچّوں کو شکار کھیلنا سکھاتی تو پنکی بھی وہاں موجود ہوتی۔ دن ہفتے اور ہفتے مہینوں میں بدل گئے۔ پنکی جو ذرا سا بچّہ یہاں آئی تھی۔ اب ایک خوبصورت بلّی کی شکل اختیار کر چکی تھی۔ پانچ بلّیوں کے اس گھرانے کا واحد بلّا رابہ تو اب صبا کا دیوانہ تھا۔ جدھر وہ جاتی وہ بھی اُدھر ساتھ ساتھ ہوتا۔ جہاں وہ بیٹھتی۔ وہیں وہ بھی بیٹھا نظر آتا۔ گھر کی دوسری بلّیوں سے گویا اُس کی دوستی ختم ہو چکی تھی۔ اور تو اور صبا ڈیڈی کی بھی چہیتی بن چکی تھی۔ جیسے ہی وہ شام کو آفس سے آتے اور کپڑے تبدیل کر کے اخبار بینی کے لئے صوفے پر دراز ہوتے۔ صبا اُچک کر اُن کی آغوش میں بیٹھ جاتی۔ ڈیڈی اخبار کا مطالعہ کرتے ہوئے اپنے ایک ہاتھ سے صبا کو سہلاتے بھی جاتے اور صبا آنکھیں بند کئے اُن کی آغوش میں آرام سے بیٹھی رہتی۔ اس دوران اگر رانی، بلیکی، ملکہ، یا کیتھی ڈیڈی کے قریب جانے کی کوشش کرتی تو رابہ ہلکے سے غرّانے لگتا اور اُس کی غرّاہٹ سُنتے ہی وہ بلّیاں دُم سمیٹ کر پیچھے ہٹ جاتیں۔ گویا رابہ نے اُنہیں غرّا کر کہا ہو کہ خبردار... جو ذرا

بھی آگے بڑھنے کی جرأت کی اور وہ جان کی خیر مناتے ہوئے اپنی حدود میں سمٹ جاتیں۔

صبا بہت ہی اصول پسند اور تمیز دار تھی۔ کبھی کبھی تو میں سوچتا اُس نے یہ سارے قاعدے قرینے کہاں سے سیکھے ہیں۔ جب تک امی اُسے خود دودھ پینے کے لئے نہ دیتی وہ کبھی دودھ میں منہ نہ ڈالتی۔ گھر میں ہر بلی کے لئے دودھ اور چھیچھڑوں کا برتن الگ تھا۔ یہ کبھی نہیں ہوا کہ صبا نے کسی اور کے برتن میں منہ ڈال دیا ہو۔ جبکہ دوسری بلیوں میں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔

کل صبح کی بات ہے میں نے ناشتے میں مصروف تھا۔ ملکہ قریب ہی بیٹھی میاؤں میاؤں کرکے مجھ سے اپنی بھوک کا اظہار کر رہی تھی۔ اس کی میاؤں میاؤں سُن کر صبا بھی وہاں آگئی۔ اُس نے ہلکے سے غرّاہٹ کی آواز نکالی اور ملکہ دُم دبا کر میز کے نیچے بیٹھ گئی۔

ہاں پنکی اب تک اس کے لئے اپنے دل میں جگہ پیدا نہیں کر سکی تھی۔ یہ اور بات تھی کہ صبا کے لئے اس کی مخالفت میں اب وہ شدت نہیں رہی تھی۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھ لو۔ گویا پنکی نے صبا کے ساتھ یہ سمجھوتا کر لیا تھا کہ نہ وہ اس کی مخالفت کرے گی اور نہ صبا اس کے کسی کام میں مداخلت کرے گی۔ میں نے بھی صبا کو کبھی پنکی کے بیڈ روم میں آتے یا جاتے نہیں دیکھا تھا... اس طرح صبا نے پنکی پر شاید یہ جتا دیا تھا کہ اگر تم میری طرف توجہ نہیں دیتی ہو تو مجھے بھی تمہاری کوئی پرواہ نہیں ہے۔

صبا گو سب سے بعد میں اس گھر میں آئی وہ عمر میں بھی سب سے چھوٹی تھی۔ مگر یہ بات صاف محسوس کی جا سکتی تھی۔ کہ وہ سب پر حاوی بھی ہے۔ کیتھی، رانی، ملکہ اور بلیکی اس کی غرّاہٹ پر الرٹ ہو جاتے۔ راجہ اس کے آگے پیچھے پھرتا۔ اس کی چال میں بڑا وقار اور دبدبہ سا تھا۔

ایک دن شام کے وقت ہم سب صحن میں بیٹھے ناشتہ کر رہے تھے کہ امی نے اطلاع دی کہ صبا، بلیکی اور رانی بچے دینے والی ہیں۔ میں تو حسبِ معمول خاموشی سے ناشتہ کرنے میں مصروف رہا۔ مگر پنکی اپنی حیرت کا اظہار کئے بغیر نہ رہ سکی۔

"امی! تینوں بلیاں ایک ساتھ بچے دیں گی...؟" مگر امی نے اس کی حیرت کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔ اب وہ ڈیڈی سے مخاطب تھیں۔ ان کا سوال تھا کہ اس بار ان بچوں کا کون، کون خواہشمند ہے...؟ ایک تو اپنے رضوی صاحب کی بیگم مانگ رہی تھیں۔ اُنہیں ایرانی بلی کا بچہ چاہیئے۔ اور انڈونیشین بلی کے بچے کی خواہش سلمیٰ باجی کو ہے۔ نوشی جو بڑی دیر میں بات سمجھی، خوش ہو کر تالیاں بجاتے ہوئے بولی۔ "آہاہا... اب تو گھر میں بہت ساری بلیاں ہو جائیں گی۔ خوب میاؤں میاؤں کا مچھلی بازار لگا کرے گا گھر میں۔" اس بات پر سب ہی کا قہقہہ لگا۔ امی اپنی بات کا جواب نہ پا کر کچن میں چلی گئیں۔

بیلی، رانی اور صبا کی اچھل کود اور بھاگ دوڑ میں اب خاصی کمی واقع ہو چکی تھی۔ چند دنوں کے وقفے سے پہلے رانی نے چار سفید بچے دیئے۔ پھر صبا نے اور صبا کے بعد بیلی نے۔ تینوں مائیں امی کے بیڈروم کی پشت پر بنے برآمدے اور اسٹور روم سے ملحق خالی کوٹھری کا ایک ایک کونا اپنے لئے مخصوص کئے پڑی تھیں۔ ذرا سا بھی خطرہ محسوس کرتے ہی وہ غرّانے لگتیں۔ وہ اپنے بچوں کی حفاظت کے لئے ہمہ وقت چوکس رہتیں۔

ایک دن پنکی برآمدے میں بیٹھی اپنا ہوم ورک کر رہی تھی۔ امی قریب بیٹھی نٹنگ کر رہی تھیں۔ اتفاقاً کیتھی اور ملکہ، راجہ کے ساتھ ادھر آنکلیں۔ فوراً ہی تینوں مائیں غرانے لگیں۔ شاید انہیں ان تینوں سے اپنے بچوں کے لئے خطرہ محسوس ہوا ہوگا۔ امی نے سمجھایا ہر جاندار اپنے بچوں کی حفاظت کرتا ہے۔ ممتا کا جذبہ خدا کی طرف سے ایک عطیہ ہے۔ اگر یہ جذبہ نہ ہو تو بچوں کی پرورش کا سارا نظام ہی درہم برہم ہو جائے۔

اسی لمحے ایک ساتھ دو کاروں کے ہارن کی آواز سماعت سے ٹکرائی۔ پنکی نے خوش ہو کر اپنا ہوم ورک پیچھے رکھا اور خوشی سے چلاتی ہوئی بھاگی۔ "ڈیڈی آگئے... انکل آگئے... ڈیڈی آگئے... انکل آگئے"

پنکی کے بعد امی بھی اُٹھ کر کچن میں چائے بنانے کے لئے اُٹھ گئیں۔ اور ان کے ساتھ ساتھ کیتھی ملکہ اور راجہ بھی وہاں سے باہر نکل گئے۔ چاروں طرف سے میدان صاف اور محفوظ پا کر رانی بھی اُٹھی اور دھیرے دھیرے چلتی ہوئی برآمدے سے باہر نکل کر لان میں پہنچ گئی۔ شامتِ اعمال عین اسی وقت باہر سڑک پر کھیلتے ہوئے بچوں کی زوردار شاٹ سے کرکٹ کی بال باؤنڈری کراس کرتی ہوئی بنگلے میں داخل ہوئی اور دھم سے رانی کے سر سے ٹکرا گئی... میاؤں میاؤں کی کربناک آوازیں نکالتی ہوئی رانی دو چار لڑھکنیاں کھاتی ہوئی ایک طرف کو نڈھال ہو کر گر پڑی۔

"ڈیڈی... رانی کو دیکھئے اسے کیا ہُوا" پنکی جو اُس کی چیخ سُن کر ادھر ہی پہنچ گئی تھی گھبرا کر چلائی۔ اس کی آواز سُن کر امی پاپا اور انکل ایک ساتھ اس طرف دوڑے۔

رانی بے سُدھ چت پڑی ہوئی تھی۔ اس کے دل کی دھڑکن سفید بالوں کے نیچے گلابی کھال میں سے صاف نظر آرہی تھی۔ مگر وہ رفتار بہت مدھم تھی "پانی لاؤ... اکبر خان" ڈیڈی نے اس پر جھکتے ہوئے کہا... ڈرائیور لان میں لگے نل میں سے پانی لے آیا۔ ڈیڈی نے گلاس لے کر تھوڑا تھوڑا پانی اُس کے حلق میں ٹپکانے کی کوشش کی۔

"رانی... رانی..." پنکی نے اُسے بڑے پیار سے آواز دی "کیا ہوا؟ یہ کیسے گر پڑی مجھے بھی تو کچھ بتاؤ..."

امی نے اس قدر بے قراری سے پوچھا گویا رانی بلّی نہ ہو، اُن کی بیٹی ہو۔ کیتھی، ملکہ اور راجہ پھر وہاں پہنچے انہوں

نے باری باری زخمی رانی کو سونگھا اور چلے گئے۔

"رانی... رانی..." پنکی اور امّی نے تقریباً ایک ساتھ اُس کا نام لے کر آواز دی۔ رانی نے دھیرے سے آنکھیں کھول کر اُنہیں دیکھا اور پھر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ کرکٹ کھیلنے والے وہ لڑکے جو گیند لینے اندر آئے تھے وہ بھی افسردہ ہو گئے۔ ان کے چہروں پر افسردگی کے ساتھ ساتھ ندامت بھی نمایاں تھی۔ جس لڑکے کی شاٹ سے گیند اندر آئی تھی وہ بڑی لجاجت کے ساتھ کہہ رہا تھا۔

"انکل پلیز مجھے معاف کر دیں۔ غلطی میری تھی کہ سڑک پر کھیلتے ہوئے فُل ٹاس شاٹ کھیل گیا۔"

ڈیڈی نے کہا "نہیں بیٹے! غلطی تمہاری نہیں ہے۔ جب تمہارے کھیلنے کے لئے پارک اور میدان نہیں بنائے جائیں گے تو تم لوگ سڑکوں اور گلیوں ہی میں تو کھیلو گے۔ اور اس کھیل میں کسی کی کھڑکی کے شیشے ٹوٹیں گے۔ کسی کا سر پھٹے گا۔ کسی گھر میں رانی جیسی بلی زندگی سے ہار جائے گی۔ شاید اس کی موت اسی بہانے لکھی تھی۔"

امّی ایک لفظ بھی نہ بول سکیں۔ صرف دوپٹے کے پلو میں اپنے آنسو جذب کر کے رہ گئیں۔ پنکی اپنی آنکھوں میں آنسو لئے فراک کا دامن مٹھی میں دبائے امّی کے پاس کھڑی مُردہ رانی کو دیکھتی رہی... خوبصورت، شریر، تیز طرار رانی اب بے جان زمین پر پڑی تھی۔ پھر امّی اس کے شانے پر پیار سے تھپکی دیتے ہوئے اندر لے گئیں۔

پنکی نے دیکھا، راجہ دُور کھڑا اس طرف دیکھ رہا ہے جہاں لان میں رانی کا مُردہ جسم پڑا ہوا ہے۔ اُس نے امّی سے کہا امّی دیکھئے راجہ بھی اس کی موت پر اُداس ہے، پھر وہ خود بھی رونے لگی۔ جیسے رانی بلی نہ ہو، اس کی اپنی بہن ہو، پھر اُسے رانی کے بچّوں کا خیال آگیا۔ روتے روتے ہی اُس نے امّی سے پوچھا، "امّی، امّی اب اس کے بچّوں کا کیا ہوگا....؟ ابھی تو وہ اُسی کا دودھ پیتے تھے۔"

"ارے بیٹی! اب رو رو کر خود کو اتنا ہلکان مت کرو۔ رانی کے بچّوں کو میں اپنے کمرے میں اُٹھوا لوں گی اور فیڈر سے دُودھ اپنی ہی نگرانی میں پلوا دیا کروں گی..." پنکی یہ سُن کر رونا بھُول گئی۔ وہ خوشی خوشی برآمدے کی طرف دوڑی۔ تاکہ رانی کے بچّوں کو اُٹھا لائے۔ وہاں پہنچی تو اس کا ننھا سا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ کونا جہاں رانی نے بچے دیئے تھے اب خالی پڑا تھا۔ ہاں برآمدے کے دوسرے کمرے میں صبا اپنے بچّوں کو لئے ہوئے لیٹی تھی۔ اور رانی کے بچے بھی بھوک سے بیقرار اپنے گلابی گلابی منہ سے صبا کے پیٹ سے چپکے دودھ پی رہے تھے۔ صبا کا ایک بچہ وہیں اس کے پیروں کے درمیان آرام سے سو رہا تھا۔ باقی دوسرے بچّے باریک باریک آواز میں میاؤں، میاؤں کرتے کھیل رہے تھے۔

"صبا..." پنکی نے پہلی بار اس کا نام پیار سے لیا اور اس کے قریب بیٹھ کر سر پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ صبا نے اپنی آنکھیں کھول کر پنکی کو دیکھا اور پھر بند کر لیں اور دُم کو دھیرے دھیرے حرکت دینے لگی۔

انسان اور کیڑے

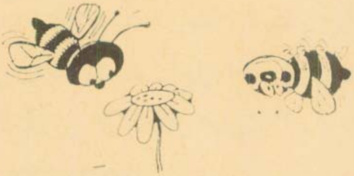

غلام مصطفٰی سولنگی

آپ نے زمین پر بے شمار کیڑے رینگتے ہوئے دیکھے ہوں گے۔ یہ کیڑے صدیوں سے انسانوں کے ساتھ کبھی اُن کی نگاہوں کے سامنے اور کبھی چھپ کر رہتے بستے ہیں۔ ہم میں سے بہت سے ایسے ہیں جنہیں کیڑوں سے بہت خوف آتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم ان سے واقف نہیں ہیں اور ہر کیڑے کو زہریلا اور خطرناک سمجھتے ہیں۔ اس مضمون میں ہم آپ کو کیڑوں کے متعلق دلچسپ معلومات سے

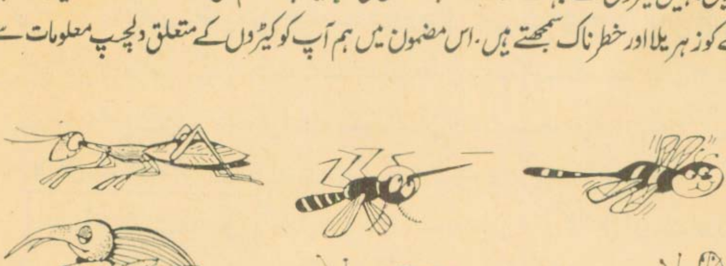

آگاہ کریں گے۔ اور اس کے پڑھنے سے پتا چلے گا کہ ان ننھی سی مخلوق کی ماہیت کیا ہے؟ اور اس کا انسانوں سے کیسا اٹوٹ رشتہ ہے؟ وغیرہ۔

کیڑوں کی ماھیت کیڑے کو انگریزی میں Insect کہتے ہیں۔ جو دراصل ایک لاطینی لفظ Insecta سے ماخوذ ہے، جس کے معنی کاٹنے یا تقسیم کرنے کے ہیں۔ یہ دنیا میں کثیر تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ یہ دنیا کے ہر خطّے میں پانی، ہوا، زمین کی اندرونی تہہ میں پائے جاتے ہیں۔ صرف وہی کیڑے جاندار کہلا سکتے ہیں۔ جن کا جسم تین حصّوں میں منقسم ہو۔ (۱) سر Head (۲) چھاتی Thorax اور (۳) پیٹ Abdomen۔

(۱) **سر** ان کے سر پر دو محاس Antenna ہوتے ہیں جو خوراک ٹٹولنے اور خطرے کو محسوس کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ دو مرکّب آنکھیں ہوتی ہیں جن سے وہ دیکھتے ہیں۔ مرکّب آنکھیں دراصل منفرد آنکھوں کے مجموعے کا نام ہے۔ سر چھ ٹکڑوں Segments سے مل کر بنتا ہے جو اس طرح جڑے ہوتے ہیں کہ بظاہر دکھائی نہیں دیتے۔

(۲) **چھاتی** پیٹ اور سر کا درمیانی حصہ تین ٹکڑوں Segments پر مشتمل ہے۔ ہر ٹکڑے پر ایک جوڑا ٹانگوں کا اور تیسرے اور پہلے ٹکڑے پر ایک ایک جوڑا پروں کا ہوتا ہے۔ جن کی مدد سے کیڑے چلنے پھرنے اور اُڑنے کا کام لیتے ہیں۔ چھاتی کے ان ٹکڑوں کو پس صدر ------ Metathorax، میان صدر Mesothorax اور اولی صدر Prothorax کہتے ہیں

(۳) **پیٹ** پیٹ کم و بیش گیارہ ٹکڑوں سے مل کر بنتا ہے۔ پیٹ پر کوئی ٹانگ نہیں ہوتی۔ پیٹ کے آخری ٹکڑے انڈے دینے یا ڈنک مارنے کے لیے استعمال کئے جاتے ہیں۔ انڈوں سے نکل کر بعد میں کیڑے مختلف حالتوں یعنی پہل روپ Larva منجھروپ Pupa اور بلوغ Adult میں اپنی زندگی کا دور مکمل کرتے ہیں۔ کیڑے کے جسم کے دونوں جانب چھوٹے چھوٹے سوراخ ہوتے ہیں۔ جن سے وہ سانس لیتے ہیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ انسان اور دوسرے عام جانوروں کے برعکس ان کا نظامِ خون ان کے عقبی پہلو Dorsal side میں ہوتا ہے جو ہر کیڑے کا خاصا ہے۔

انسانوں سے تعلّق کیڑوں اور انسانوں کے درمیان دوستی کا تعلق بھی ہے اور دشمنی کا بھی۔ اس ننھّی سی مخلوق سے انسان ابتدائے آفرینش سے نبرد آزما چلا آرہا ہے اور جب تک نسلِ انسانی ختم نہیں ہوجاتی یہ کشمکش جاری رہے گی۔ انسان جو تسخیرِ کائنات کا دعویدار ہے۔ کیڑوں کو اپنے راستے میں حائل ہونے سے باز نہیں رکھ سکتا۔ کیڑے اُس کی فصلوں کو نقصان پہنچاتے ہیں،

اس کی آنکھوں کے سامنے اُس کے مویشیوں کا تازہ خون پی جاتے ہیں اور اس کے چلنے پھرنے کھانے پینے میں مداخلت سے گریز نہیں کرتے اور انسان مجبوری کی حالت میں صرف تماشا دیکھتا رہ جاتا ہے۔ البتہ بعض اوقات انسانوں اور بعض کیڑوں میں مثلاً ۔ شہد کی مکھیوں یا ریشم کے کیڑوں میں سمجھوتہ ہو جاتا ہے۔ جس سے دونوں فائدہ حاصل کرتے ہیں، لیکن یہ سمجھوتہ محض عارضی نوعیت کا ہوتا ہے۔ آخر کار ---
وہ انسان کے دشمن ثابت ہوتے ہیں۔ اور اُسے نقصان پہنچانے سے دریغ نہیں کرتے۔ اب جب کہ انسانی آبادی تیزی سے بڑھتی جا رہی ہے اور وسائلِ خوراک اسی تناسب سے کم ہوتے جا رہے ہیں، کیڑے ہمارے لئے ایک خطرناک چیلنج بن گئے ہیں وہ ہماری اربوں کی لہلہاتی فصلوں کو برباد کر دیتے ہیں۔

انسان کے دشمن کیڑے نہ صرف مختلف طریقوں سے ہماری خوراک کی تباہی اور ضیاع کا باعث بنتے ہیں بلکہ پودوں میں مختلف بیماریاں پھیلانا بھی ان ہی کا کام ہے۔ ۱۸۹۲ء میں تحقیق سے ثابت کیا گیا کہ پھل دار پودوں کی ایک بیماری Fire slight کیڑوں کی وجہ سے ہی پھیلتی ہے۔ کیڑے اکثر عجیب و غریب طریقے سے ہماری اور جانوروں کی زندگیوں میں دخل اندازی کر کے اپنی انسان اور حیوان دشمنی کا ثبوت دیتے ہیں۔ وہ اپنی بھدّی آواز، اپنی بدبو یا رینگنے سے تکلیف دیتے ہیں۔ وہ انسانوں اور حیوانوں کے اجسام میں زہر وغیرہ داخل کر کے کئی بیماریاں پیدا کر دیتے ہیں۔

مختلف اقسام کے طفیلی کیڑے Parasite Insect مثلاً پچھڑیاں، جوئیں وغیرہ انسانوں اور حیوانوں کا خون چوس کر گزارہ کرتے ہیں اور ہماری صحت کے لئے انتہائی نقصان دہ اور ضرر رساں ہیں، اسی طرح جسم کے اندر رہنے والے درون طفیلی کیڑے Endo Parasite Insect بھی مختلف بیماریاں پھیلاتے ہیں۔ وہ غلاظت کے ڈھیروں پر بیٹھ کر اور وہاں سے مختلف جراثیم لے کر صحت مند انسانوں اور حیوانوں میں پھیلا دیتے ہیں۔ جن سے وہ کئی بیماریوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ وہ نہ صرف کھڑی فصلوں کو چٹ کر جاتے ہیں بلکہ گودام میں پڑے ہوئے غلّے کے انبار بھی ان کی زد سے نہیں بچتے۔ سُسری، کھپرا، وغیرہ عام کیڑے ہیں جو غلّے کو سخت نقصان پہنچاتے ہیں۔

انسان کے دوست کیڑے انسان کے لاکھ دشمن سہی لیکن اکثر اتنے کار آمد بھی ثابت ہوتے ہیں کہ انسان اُن کی موجودگی کا احساس شدت سے محسوس کرتا ہے، اور اُن کا دستِ نگر ہو جاتا ہے۔ مثلاً بہت سے کیڑے زرِ گل چھڑک کر پھولوں کی زیرگی Pollination میں مدد دیتے ہیں اور اس طرح نر پھول کا زرِ گل Pollen دوسرے پھول کے زیرہ گیر Stigma پر ڈالتے ہیں جس سے باروری Fertilization ہوتی ہے اور بیج وغیرہ بنتا ہے۔ شہد کی ایک مکھی دن میں ۲۴۰۰ پھولوں سے

شہد اکٹھا کرتی ہے۔ اگر کیڑے نہ ہوں تو یہ پھل، پھول، بیج وغیرہ دیکھنا نصیب نہ ہوں۔

ریشم کا کیڑا ریشم تیار کرتا ہے۔ جس پر لاکھوں مزدوروں کی روزی کا انحصار ہے اور کئی صنعتیں قائم ہیں۔ اس طرح شہد کی مکھی شہد تیار کرتی ہے جو ہر لحاظ سے مفید ہے۔ شہد کی مکھی ایک قسم کا موم اپنے پیٹ کے نچلے حصے سے نکالتی ہے۔ جو مختلف کاموں میں استعمال ہوتا ہے۔ کئی کیڑوں کے جسم بڑے مفید ہوتے ہیں۔ ان سے مختلف اقسام کے رنگ اور دوائیں تیار کی جاتی ہیں۔

کیڑے ہماری مُرغیوں کی خوراک ہیں۔ اسی طرح کئی کیڑے مچھلیوں کی خوراک بنتے ہیں جو بالواسطہ ہماری خوراک ہیں۔ بعض کیڑے مازو Galls پیدا کرتے ہیں، جن سے کئی مرکّبات تیار کیے جاتے ہیں۔ مثلاً ٹینک ایسڈ Tannic Acid بعض کیڑے کئی دوسرے کیڑوں کو ہڑپ کر جاتے ہیں جو ہماری فصلوں یا صحت پر بُرا اثر ڈالتے ہیں۔ اسی طرح وہ گلے سڑے جانور کھا کر فضا کو تعفن سے بچا لیتے ہیں۔ وہ ہماری زمین کو زرخیز بنانے میں مدد دیتے ہیں۔ وہ زمین کی ساخت Structure کو بدلتے ہیں۔

مختلف علمی و سائنسی مسائل کو حل کرنے کے لیے بہترین تجرباتی مواد ہیں، یعنی وہ ارزاں طریقوں سے پالے جاتے ہیں اور اُن پر قابو پانا بھی آسان ہے۔ فی الحقیقت ان کی خوبصورتی کسی صورت میں بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی۔ وہ ہمارے میز پوشوں، گل دستوں، دروازوں وغیرہ غرض بہت سے مقامات کو خوبصورت بنانے میں مدد دیتے ہیں۔ مختلف قسم کی تتلیوں کی خوبصورتی سے متاثر ہو کر کئی شاعروں نے اُن پر نظمیں لکھ کر ان کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔

کوڑے دان کی دردمندانہ اپیل

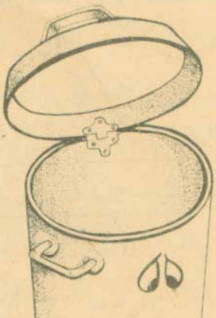

سب کو اپنا حق عزیز ہوتا ہے۔
کوڑا کرکٹ میرا حق ہے
میرے حق کو گلی میں مت پھینکیے۔
مجھے میرا حق دیجیے۔
ورنہ!
مکھیوں، مچھروں اور صفائی پسند
پڑوسیوں سے روزانہ جنگ کے لیے تیار ہو جائیے۔

عقیل عباس جعفری

گنی چُنی مُعلومات

اعداد کا ہماری زندگی سے گہرا تعلق ہے۔ دُنیا کی اہم شخصیات ہوں یا بڑے بڑے واقعات ان سب کا تعلق کسی نہ کسی طرح اعداد سے ضرور بنتا ہے۔ اعداد کے حوالے سے دُنیا بھر کی اہم معلومات پر مبنی یہ سلسلہ ہم ہر ماہ آپ کی دلچسپی اور معلومات میں اضافے کے لیے پیش کرتے ہیں صفر سے شروع ہونے والا یہ سلسلہ دیکھیے کہاں تک جاتا ہے۔

(۸۸)

- ریڈیم کا جوہری عدد ۸۸ ہے۔ یہ عنصر ۱۸۹۸ء مادام کیوری اور پیری کیوری نے دریافت کیا تھا۔
- عطارد اپنے محور کے گرد ایک چکر بھی ۸۸ دنوں میں مکمّل کرتا ہے اور سورج کے گرد اپنا چکر بھی ۸۸ دنوں میں مکمّل کرتا ہے۔
- روس کے محکمۂ موسمیات نے ۲۴ اگست ۱۹۶۰ کو ووسٹوک (انٹارکٹیکا) کے مقام پر ۸۸/۲- درجے سینٹی گریڈ درجہ حرارت ریکارڈ کیا تھا۔
- مشہور اداکار چارلی چپلن کا انتقال ۱۹۷۷ء میں کرسمس کے دن ہوا۔ انتقال کے وقت اس کی عمر ۸۸ برس تھی۔
- ۶۳ - ۱۹۶۲ء میں واشنگٹن اور نیویارک میں دنیا کی مشہور پینٹنگ مونالیزا کی ۸۸ دن تک نمائش ہوئی تھی۔
- زُحل، سورج سے ۸۸ کروڑ ۶۱ لاکھ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔
- حضرت رابعہ بصریؒ نے ۸۰۱ء میں وفات پائی۔ انتقال کے وقت آپ کی عمر ۸۸ برس تھی۔
- پیانو میں ۸۸ بٹن (KEYS) ہوتے ہیں۔ ۳۶ بٹن سیاہ اور ۵۲ بٹن سفید۔
- مغل بادشاہ اورنگ زیب عالمگیر نے ۱۷۰۷ء میں ۸۸ برس کی عمر میں وفات پائی۔

(۸۹)

- دنیا کے پہلے خلا باز یوری گگارین نے زمین کے گرد پہلا چکر ۸۹ ، منٹ ۶ ، سیکنڈ میں مکمل کیا تھا ۔
- تین مسلسل مہینوں میں سب سے کم دن فروری، مارچ اور اپریل میں ہوتے ہیں یعنی ۸۹ ، دن ۔
- آسٹریلیا کی ۸۹٪ آبادی شہروں میں رہتی ہے ۔
- ارجنٹائن اور برطانیہ کے درمیان جنوبی جارجیا اور فاک لینڈ کے مسئلے پر ۱۹ ، مارچ تا ۱۵ ، جون ۱۹۸۲ء ۸۹ ، دنوں تک جنگ جاری رہی تھی ۔
- امریکی صدر ہربرٹ کلارک ہوور کو دنیا کی مختلف یونیورسٹیوں نے ۸۹ اعزازی ڈگریاں دی تھیں ۔
- ۲۲ ، دسمبر سے ۲۰ ، مارچ تک کا عرصہ جو سرکاری طور پر موسم گرما کہلاتا ہے ' ۸۹ ، دنوں تک محیط ہوتا ہے ۔
- مشتری کا قطر خطِ استوا کے لحاظ سے ۸۹ ، ہزار میل ہے جو اس کے قطبی قطر ۸۴ ، ہزار میل سے ۵ ، ہزار میل زیادہ ہے ۔
- پانی کا ۸۹٪ حصہ آکسیجن پر مشتمل ہوتا ہے ۔
- برطانیہ کے ۸۹٪ گھروں میں ریفریجریٹر موجود ہے ۔
- بیسویں صدی کے سب سے بڑے آرکیٹیکٹ فرینک لائیڈ رائٹ کا انتقال ۱۹۵۹ء میں ہوا ۔ انتقال کے وقت اس کی عمر ۸۹ ، برس تھی ۔

(۹۰)

- سرفراز نواز نے اپنے آخری ٹیسٹ میچ میں ۹۰ ، رنز بنائے تھے ۔ جو سرفراز نواز کا سب سے زیادہ انفرادی اسکور تھا ۔
- چاند کا درجۂ حرارت "دن" کے وقت ۹۰ ، درجے سینٹی گریڈ ہوتا ہے ۔
- دنیا کی برف کا ۹۰٪ حصہ انٹارکٹیکا میں ہے ۔
- پودوں میں ۹۰٪ پانی پایا جاتا ہے ۔
- دنیا کی سخت ترین شے ہیرا ہے جو دنیا کی دوسری سخت ترین شے کورنڈم سے ۹۰ ، گنا زیادہ سخت ہوتا ہے ۔
- ۱۹۵۶ء میں جم لیکر نے آسٹریلیا کے خلاف ٹیسٹ میچ میں دونوں اننگز میں مجموعی طور پر ۱۹ وکٹیں حاصل کی تھیں ۔ اور صرف ۹۰ ، رنز دیے تھے ۔
- کیوبا اور امریکہ کا کم سے کم فاصلہ ۹۰ ، میل ہے ۔
- دنیا کا ۹۰٪ گریپ فروٹ امریکہ میں پیدا ہوتا ہے ۔
- دنیا کے سب سے بڑے جاندار بلیو وہیل کی اوسط عمر ۹۰ ، سال ہوتی ہے ۔

- مشہور خاتون فلورنس نائٹ انگیل کا انتقال ۱۹۱۰ء میں ۹۰ برس کی عمر میں ہوا تھا۔

(۹۱)

- ہاکی کے میدان کی لمبائی ۹۱٫۵ میٹر اور چوڑائی ۵۰ تا ۵۵ میٹر ہوتی ہے۔
- خون کے پلازما میں ۹۱٪ پانی ہوتا ہے۔
- لندن میں ۹۱ ممالک کے سفارت خانے موجود ہیں۔
- ۱۰۰ گز ۹۱٫۵ میٹر کے برابر ہوتا ہے
- ۱۴ اپریل ۱۹۱۲ء کو مشہور جہاز ٹائی ٹینک میں برف کے تودے سے ٹکرانے سے ۹۱ میٹر لمبا سوراخ ہوگیا تھا۔ جس کے باعث وہ جہاز غرق ہوگیا۔
- سب سے چھوٹا زاویہ منفرجہ ۹۱ درجے کا ہوتا ہے۔
- مشہور مصور پکاسو کا انتقال ۱۹۷۳ء میں ہوا۔ انتقال کے وقت اُن کی عمر ۹۱ برس تھی۔
- برطانیہ کی ہر ایک میل لمبی سڑک پر کاروں کی اوسط تعداد ۹۱ ہے۔
- ایفل ٹاور کے انجینئر گستاف ایفل کا انتقال ۱۹۲۳ء میں ۹۱ برس کی عمر میں ہوا تھا۔

(۹۲)

- آنحضرتؐ کے اسم مبارک "محمدؐ" کے اعداد کا مجموعہ ۹۲ ہے۔
- دنیا کا پہلا خلائی جہاز اسپٹنک اول خلا میں ۹۲ دن گزارنے کے بعد از خود تباہ ہوگیا تھا۔
- بابائے اُردو مولوی عبدالحق کا انتقال ۱۹۶۱ میں ہوا۔ اس وقت اُن کی عمر ۹۲ برس تھی۔
- تین لگاتار مہینوں میں زیادہ سے زیادہ ۹۲ دن ہو سکتے ہیں۔ مئی، جون، جولائی، جون، جولائی، اگست، جولائی، اگست، ستمبر، اکتوبر، نومبر، دسمبر یا نومبر، دسمبر، جنوری،
- لندن کے مشہور ویمبلے اسٹیڈیم میں ۹۲ ہزار افراد کی گنجائش ہے۔
- دنیا میں ۹۲ قدرتی عناصر پائے جاتے ہیں۔
- اولمپک گولڈ میڈل میں ۹۲٪ چاندی اور ۸٪ گلٹ ہوتا ہے۔

اپالو گیارہ کے خلا باز اپنے ہمراہ چاند کی سطح کے ۹۲ نقشے لے گئے تھے۔

- یورینیم کے مرکزے میں ۹۲ پروٹون اور ۹۲ الیکٹرون ہوتے ہیں۔
- تربوز میں ۹۲ فیصد پانی ہوتا ہے۔

(۹۳)

- امریکہ کا مشہور مجسمۂ آزادی ۹۳ / میٹر بلند ہے۔
- آسٹریلیا کا دوسرا بڑا دریا میورے، وہاں کے سب سے بڑے دریا ڈارلنگ سے ۹۳ / میل چھوٹا ہے۔
- فٹ بال کے مشہور کھلاڑی پیلے نے اپنے کیریئر میں ۱۳۶۳ / فرسٹ کلاس میچ کھیلے اور مجموعی طور پر ۱۲۸۲ گول سکور کیے جن میں ۹۳ / ہیٹ ٹرکس بھی شامل ہیں۔
- زمین سے قریب ترین ستارہ سورج ہے۔ جو زمین سے ۹۳ ملین میل کے فاصلے پر واقع ہے۔
- پیریاڈک ٹیبل میں پہلا مصنوعی عنصر نیپچونیم ہے۔ جس کا کیمیائی عدد ۹۳ / ہے۔
- دنیا کا سب سے بڑا ہوٹل ماسکو کا بارہ منزلہ ہوٹل "روسیا" ہے۔ اس ہوٹل کے ۳۲۰۰ کمروں میں ۵۳۵۰ مہمانوں کے ٹھہرنے کی گنجائش ہے۔ اس ہوٹل میں لفٹوں کی تعداد ۹۳ / ہے۔
- صرف نیویارک میں ۹۳ / ریڈیو اسٹیشن ہیں۔
- ۲۱ / مارچ سے ۲۱ / جون تک کے عرصے کو موسم بہار اور ۲۲ جون سے ۲۲ / ستمبر تک کے عرصے کو موسم گرما کہا جاتا ہے یہ دونوں موسم ۹۳ - ۹۳ دنوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔
- دنیا کا ۹۳٪ چاول ایشیاء میں پیدا ہوتا ہے۔

(۹۴)

- پاکستان کے سب سے طویل القامت شخص عالم چنہ کا قد ۹۴ / انچ ہے۔
- دنیا کی مشہور ٹرین اورینٹ ایکسپریس کا آغاز ۵ / جون ۱۸۸۳ء کو ہوا تھا اور اختتام ۹۴ / برس بعد ۲۰ / مئی ۱۹۷۷ء کو۔
- کرکٹ کے ایک روزہ بین الاقوامی میچوں کا آغاز ٹیسٹ کرکٹ کے آغاز ۱۸۷۷ء کے ۹۴ / برس بعد ۱۹۷۱ء میں ہوا۔ اور پہلے ٹیسٹ میچ کی طرح پہلا ایک روزہ بین الاقوامی میچ بھی انگلستان اور آسٹریلیا کے درمیان ہی کھیلا گیا۔
- ولیم شیکسپیئر کی مکمل تخلیقات دنیا کی ۹۴ / زبانوں میں منتقل ہو چکی ہیں۔
- برصغیر کا مشہور اخبار، سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور، ۳ / ستمبر ۱۹۶۳ء کو بند ہوا۔ یہ اخبار ۹۴ / برس جاری رہا۔
- ملکہ وکٹوریہ، اپنے شوہر شہزادہ البرٹ سے ۹۴ / دن بڑی تھیں۔
- جارج برنارڈ شا کا انتقال ۱۹۵۰ء میں ہوا۔ انتقال کے وقت ان کی عمر ۹۴ / برس تھی۔
- ایک اوسط سائز کے کیلے میں ۹۴ / حرارے CALORIES ہوتے ہیں۔
- جیلی فش کا ۹۴٪ حصہ پانی پر مشتمل ہوتا ہے۔
- برطانیہ کا رقبہ ۹۴،۲۵۰ / مربع میل ہے۔

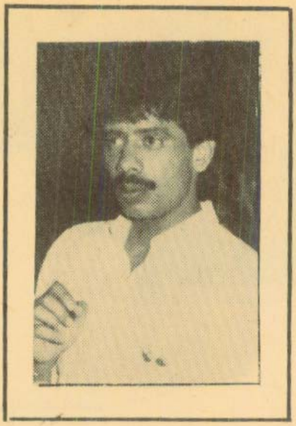

جہانگیر خان

جہانگیر خان ۸ر دسمبر ۱۹۶۳ء کو کراچی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد روشن خان نے ۱۹۵۶ء میں برٹش اوپن اسکواش چیمپئن شپ جیتی اور عالمی چیمپئن کا اعزاز حاصل کیا۔ جہانگیر خان نے ابتدا ہی سے اسکواش میں دلچسپی لی، وہ بچپن میں انتہائی کمزور تھے۔ ان کے ہرنیا کے بھی دو آپریشن ہوئے۔ ڈاکٹروں نے انھیں اسکواش کھیلنے سے بالکل منع کر دیا لیکن انھیں اسکواش سے جنون کی حد تک محبّت تھی۔ انھوں نے چوری چھپے اسکواش کھیلنے کا سلسلہ شروع کیا۔ والد کو پتہ چلا تو انھوں نے حوصلہ افزائی فرمائی ۱۴ سال کی عمر میں پاکستان جونیئر چیمپئن بننے کے بعد وہ اپنے بڑے بھائی طورسم خان کے پاس لندن چلے گئے۔ ۱۹۷۹ء میں انھیں اپنی زندگی کے سب سے بڑے المیے سے گزرنا پڑا۔ آسٹریلیا میں اسکواش میچ کے دوران ان کے بھائی طورسم خان پر دل کا دورہ پڑا جو جان لیوا ثابت ہوا، لیکن خدا نے انھیں یہ صدمہ برداشت کرنے کا حوصلہ دیا۔ ان کے کزن رحمت خان نے جہانگیر خان کے لیے اپنا پورا مستقبل داؤ پر لگا دیا۔ اور ان کی تربیت شروع کر دی۔ جہانگیر خان ۱۹۸۰ء سے اب تک مسلسل اسکواش کے قومی چیمپئن ہیں۔ ۲۸ر نومبر ۱۹۸۱ء کو جہانگیر نے کنیڈا کے شہر ٹورنٹو میں ورلڈ اوپن اسکواش ٹورنامنٹ میں عظیم کھلاڑی جیف ہنٹ کو ۷-۹، ۹-۲، ۹-۱، ۹-۱ سے شکست دے کر عالمی چیمپئن شپ حاصل کی۔ اس وقت ان کی عمر ۱۸ سال سے بھی کم تھی۔ ۱۹۸۲ء سے جہانگیر خان برٹش اوپن اسکواش چیمپئن شپ بھی مسلسل جیت رہے ہیں۔ وہ ۸۵-۱۹۸۴ء میں امریکی طرز کی اسکواش ہارڈ بال کے بھی عالمی چیمپئن رہے۔ دونوں طرز کے عالمی چیمپئن بننے والے وہ دنیا کے واحد کھلاڑی ہیں۔

ننھّی نگارشات

نوخیز قلم کاروں کی مختصر تحریروں سے انتخاب

ایک ضروری بات

ادارہ آنکھ مچولی نے بارہا اپنے لکھنے والوں سے درخواست کی ہے کہ وہ نقل شُدہ تحریروں کے بجائے ہمیں اپنی ذاتی تحریریں بھجوائیں ۔ خواہ وہ کتنی ہی کمزور کیوں نہ ہوں، لیکن بار بار کی یاد دہانیوں کے باوجود بھی بعض ساتھی ہمیں دوسروں کی تحریریں اپنے نام سے بھجوا دیتے ہیں ۔ ایسا کرنا بد دیانتی بھی ہے اور تکلیف دہ عمل بھی۔ نقل شدہ تحریریں بھجوانے کے اس منفی رجحان کو روکنے کے لیے ہم اپنے قارئین ساتھیوں کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ تمام تحریریں بغور پڑھیں اور اگر چوری کی ہوئی یا نقل شُدہ کوئی تحریر دیکھیں تو براہِ کرم فوراً اس کی نشاندہی کریں۔ چوری کی تحریریں بھجوانے والوں کے لیے ہمیں مجبوراً "بلیک بکس" کا ایک سلسلہ شروع کرنا پڑ رہا ہے ۔ یہ گویا ایک چھوٹی سی سزا ہے ۔ جو ساتھی بھی ہمیں نقل شُدہ تحریر بھجوائے گا ہم اُس کا نام اور پتہ "بلیک بکس" میں شائع کیا کریں گے ۔ نہ صرف یہ بلکہ "آنکھ مچولی" میں آئندہ ان کے نام سے کبھی کوئی تحریر شائع نہ ہو سکے گی۔ (بلیک بکس "ننھی نگارشات" کے آخری صفحے پر دیکھیے ۔)

آنکھ مچولی

اشفاق احمد راں ۔ بھکر

یہ رسالہ ہے نوجوانوں کا — ملک وملّت کے پاسبانوں کا
جو بھی اس کو پسند کرتے ہیں — اپنی قسمت بلند کرتے ہیں
علم وحکمت کا یہ خزانہ ہے — اس کا انداز دلبرانہ ہے
معتبر اس کے لکھنے والے ہیں — اس کے مضمون سب نرالے ہیں
خوابِ غفلت سے یہ جگاتا ہے — رازِ جینے کے یہ بتاتا ہے
ننھے بچّوں کا چاند تارا ہے — اس کا دلچسپ ہر شمارہ ہے
اس کی ہر ایک چیز پیاری ہے — فیض اس کا مدام جاری ہے
اس کا ہر لفظ دل لُبھاتا ہے
اس کے اشفاق گیت گاتا ہے

خدا کی لاٹھی

شہزاد احمد عمران، فیصل آباد

ایک غریب آدمی نے ایک دولت مند آدمی کے دروازے پر جا کر سوال کیا کہ مانگنے سے تو مجھے خود نفرت ہے مگر کیا کروں کہ بچّوں پر تین فاقے گزر گئے ہیں ۔ مجبور ہو کر آپ کے دروازے پر آیا

ہوں"۔ خدا کے لیے میری مدد کیجیے۔ آپ کی مہربانی سے چار آدمیوں کی جانیں بچ جائیں گی۔"

وہ دولت مند بڑا کنجوس تھا بھلا یہ باتیں کب سُنتا۔ اُس نے مدد کرنے کے بجائے غریب کو دھکے دے کر نکال دیا بے چارہ ذلیل ہو کر نامُراد واپس ہوا۔ زمانہ سدا ایک سا نہیں رہتا۔ وقت کا یہ پھیر دیکھو کہ جو دولت مند تھا وہ دو ہی برس میں قلاش ہو گیا۔ نوکر چاکر بھی مجبور ہو کر دوسروں کے ہاں ملازم ہو گئے ایک نوکر نے جس آدمی کے یہاں ملازمت کی وہ بڑا نیک دل اور سخی تھا۔ فقیروں کی حاجت پوری کرتا اور غریبوں کی جی کھول کر مدد کرتا۔ ایک رات دس بجے قیامت کی سردی کے ساتھ ساتھ موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ لوگ اپنے گھروں کے دروازے بند کر کے بستروں میں دبکے پڑے تھے کہ سخی کے دروازے پر دستک ہوئی ایک بوڑھا فقیر آواز دے رہا تھا اگرچہ اُس کی آمد بے وقت تھی۔ مگر سخی نے فقیر کو ٹھہرنے کے لیے کہا اور نوکر کو آواز دی کہ بوڑھے کو فوراً کھانا کھلائے۔ نوکر حُکم بجا لایا۔ اور جب واپس ہُوا تو سخی نے کہا دیکھا کہ وہ زار و قطار رو رہا ہے۔ رونے کا سبب پوچھا تو نوکر بولا۔

"میں جس فقیر کو روٹی دے کر آرہا ہوں، وہ آپ سے پہلے میرا آقا تھا۔ ابھی دو تین برس گزرے اس کے دروازے پر گھوڑے ہنہناتے تھے اور اندر باہر روپوں کی بارش ہوتی تھی۔ آج یہ حال دیکھ کر میرا دل بھر آیا۔" سخی نے کہا

"ذرا میں بھی تو دیکھوں وہ کون ہے؟" گھر سے باہر نکلا تو فقیر کو پہچان کر بے اختیار پکار اُٹھا۔

"میاں بُڈھے! ذرا دیکھو تو میں جو تمہارے سامنے کھڑا ہوں کیا وہی غریب آدمی نہیں کہ ایک بار تین دن کے فاقے سے تمہارے یہاں گیا تھا۔ اور تم نے دھکے دے کر نکلوا دیا تھا۔"

بوڑھا فقیر اُسے دیکھ کر رو دیا اور بولا۔

"ہاں میں وہی بدنصیب ہوں۔ میں نے خدا کے خوف کی پرواہ نہ کی اور اس حال کو پہنچا۔"

انسان کو ہر حال میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیئے۔ کیونکہ وقت بدلنے میں دیر نہیں لگتی۔ یہ مال و دولت سب وقتی ہیں۔ آخرت میں تو صرف نیکی کام آئے گی۔

جارج اسٹیفنسن (موجد ریلوے انجن)

مقصود احمد صدیقی۔ اورنگی ٹاؤن کراچی

کامیاب لوگوں کے زمرے میں سب سے دلچسپ داستانِ حیات اُس اَن پڑھ لڑکے کی ہے جس نے سترہ سال کی عمر میں اپنا نام لکھنا سیکھا لیکن وقت نے اُسے دُنیا کا سب سے بڑا انجینئر (ریلوے) ثابت کیا۔ جارج اسٹیفنسن ۱۷۸۱ء

میں انگلستان میں نیوکیسل New Castle کے قریب پیدا ہوا۔ اُس زمانے میں کانوں سے پانی نکالنے کے لیے دخانی انجن استعمال کیے جاتے تھے۔ جارج کا باپ ایسے ہی ایک انجن میں کوئلہ جھونکنے میں ملازم تھا۔ جارج بھی یہی کام سیکھنا چاہتا تھا۔ اُس نے دس سال کی عمر میں کام کرنا شروع کیا۔ اُس کی خواہش تھی کہ اُسے پمپنگ انجن کا چارج مل جائے۔ اور آخرکار سولہ سال کی عمر میں اس کی یہ آرزو پوری ہوگئی۔ اُسے ایک پمپنگ انجن کا چارج مل گیا۔

جارج اسٹیفنسن ایک قابل مستری ثابت ہوا۔ لیکن اُس نے محسوس کیا کہ لکھے پڑھے بغیر اُسے انجنوں کے بارے میں زیادہ واقفیت حاصل نہیں ہوسکتی۔ سترہ سال کی عمر میں اُس نے نائٹ اسکول میں پڑھنا شروع کیا۔ وہ دن میں بارہ گھنٹے کام کرتا تھا اور رات کو پڑھتا تھا۔ اُسے ترقی کا ایک موقعہ اُس وقت ملا جب انگلستان کے سب سے بڑے انجینئر کا بنایا ہوا ایک نیا اور گراں قیمت انجن خراب ہوگیا۔ یہ انجن اُسی کان پر تھا جہاں جارج ملازم تھا۔ اُس نے انجن کو کھول کر اُسے ٹھیک کیا اور چار دن کے اندر اندر اُسے جوڑ کر دوبارہ کام کرنے کے قابل بنا دیا۔ اب اس میں کوئی نقص باقی نہ رہا تھا۔ اس طرح کان کا سارا پانی باہر نکال دیا گیا۔ جن کان کنوں کو بے روزگاری کا سامنا ہوگیا تھا وہ سب

کام پر لگ گئے۔ تھوڑے عرصے پر اسٹیفنسن اسی کان پر انجینئر ہوگیا۔

اُس کے نئے فرائض میں کوئلے کی کان پر کام کرنے والے انجنوں کی دیکھ بھال شامل تھی۔ اُسے اس تجربہ کی ضرورت بھی تھی۔ جارج نے دخانی انجنوں میں نہ صرف متعدد اصلاحات کیں بلکہ انھیں چلانے کا خرچ بھی کم کر دیا۔ آخر میں اُس نے کان کے مالکوں کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ ایک "سفری انجن" تیار کرائیں۔ مالکوں کی اجازت سے جارج نے ایک ایسا ریلوے انجن تیار کیا جس میں دو عمودی سلنڈر لگے تھے اور اُس کے بوائلر کی لمبائی آٹھ فٹ اور قطر تین فٹ تھا۔ جارج نے اپنے اس انجن کو چلانے کے لیے لوہے کی ایک لائن بچھائی۔ جس پر ۱۸۱۴ء میں مال سے بھرے ہوئے آٹھ ڈبے کھینچے گئے۔ ان کا وزن تیس ٹن سے زیادہ اور انھوں نے چار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے کچھ چڑھائی طے کی۔

پہلی مسافر گاڑی:۔ اسٹیفنسن نے

محسوس کیا کہ اس کا انجن بہت شور کرتا ہے۔ لہٰذا اُس نے سلنڈروں میں کچھ تبدیلی پیدا کی جس کی وجہ سے خارج ہونے والی بھاپ ہوا میں نکلنے کے بجائے آگ والی چمنی میں آجاتی تھی اس طرح بھاپ کے تیز جھونکے سے بھٹی کی آگ زیادہ تیزی سے جلنے لگی۔ جارج اسٹیفنسن کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ اُس نے دنیا کی پہلی مسافر ٹرین بنائی جسے ایک دخانی انجن کھینچتا تھا۔ ۱۸۲۹ء میں اُس نے بھاپ کا ایک ایسا انجن تیار کیا (جس کا نام راکٹ رکھا گیا) جس نے پہلی مرتبہ ۱۸۳۰ء میں لیورپول اور مانچسٹر کے درمیان تقریباً ۳۰ میل کے فاصلے تک کوئلے کے چھ ڈبے اور چھ سو سے زیادہ مسافروں سے بھرے ہوئے ۲۲ ڈبے تقریباً ۱۲ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے کھینچے۔ آج ہمیں یہ رفتار کچھ زیادہ معلوم نہیں ہوتی لیکن جارج کی اس کامیابی نے ریل کے سفر کی بنیاد ڈالی۔

جب ۱۸۴۸ء میں اسٹیفنسن کا انتقال ہوا تو وہ دنیا کا مشہور ترین ریلوے انجینئر تھا۔ اور اُس نے کافی دولت کمائی تھی۔ اس کی داستانِ حیات میں ہم سب کے لیے ایک سبق موجود ہے۔ وہ شروع میں اَن پڑھ تھا۔ لیکن اُس نے اپنے فالتو وقت میں ذاتی محنت اور کوششوں سے لکھنا پڑھنا سیکھا۔ اُس نے انجینئری کی واقفیت حاصل کی۔ وہ بڑا ہنرمند آدمی تھا۔ مشینوں کے کسی کام سے نہیں گھبراتا تھا۔

ایک بار پھر

کامران سلیم۔ نارتھ ناظم آباد، کراچی

عارف ڈبل روٹی لینے کے لیے گھر سے نکلا ہی تھا کہ ایک تیز رفتار اسکوٹر اُسے ٹکر مارتا ہوا گزر گیا۔ عارف کے منہ سے چیخیں نکل گئیں۔ اور وہ زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔ عارف کی چیخیں سن کر بہت سارے لوگ اُس کے اردگرد جمع ہو گئے۔ اُس کے اردگرد کھڑے لوگ ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے کہ ایکسیڈینٹ کیسے ہوا۔ مگر کوئی اتنا نہیں کر رہا تھا کہ بڑھ کر عارف کو گود میں اُٹھا کر اسپتال لے جائے۔ شاید وہ سب لوگ حواس باختہ تھے۔ یا شاید بے حس یا شاید اور کچھ۔ یکایک ایک بابا جی بھیڑ کو چیرتے ہوئے آگے آئے اور عارف کو اپنے بازوؤں میں اُٹھا کر اُسے اسپتال لے گئے۔ عارف کو یہ باتیں بس خواب کی طرح یاد رہ گئیں۔ عارف کو اتفاق سے معمولی زخم آئے تھے۔ اُس کی سب ہڈیاں سلامت تھیں۔

اسپتال میں عارف کو ہوش آیا تو اُس نے سب سے پہلے اُس شخص کے بارے میں پوچھا جو اُسے اُٹھا کر اسپتال لایا تھا۔ ابو نے عارف کو بتایا کہ اُسے اسپتال لانے والا شخص اُن کی گلی کے کونے پر بیٹھنے والا موچی ہے۔ عارف کا دل موچی بابا کے لئے محبت سے بھر گیا۔ اُس کا جی چاہا کہ وہ ابھی اُٹھ کر موچی بابا کے پاس جائے اور اُن کا شکریہ ادا کرے مگر یہ ابھی ممکن نہ تھا۔

اسپتال سے فارغ ہوتے ہی عارف موچی بابا کے پاس گیا اور اُن کا بہت شکریہ ادا کیا۔ عارف کے دل میں رہ رہ کر یہ خواہش پیدا ہوئی کہ وہ کسی طرح بابا کے احسان کا بدلہ چکائے۔ مگر آخر کس طرح؟ وہ تو اُس سے اتنے بڑے تھے۔ پھر بھلا وہ اُن کے کیسے کام آئے؟ عارف اکثر سوچتا۔ ایک روز اُس کے دل میں بڑا عجیب سا خیال آیا۔ کاش بابا کا بھی ایکسیڈینٹ ہو جائے۔ اور پھر میں انہیں لے کر اسپتال جاؤں۔ عارف کو اپنا یہ خیال بڑا عجیب سا لگا۔ مگر اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ ہوئی کہ یہ خیال اُس کے ذہن پر ہر وقت سوار رہنے

لگا ۔ عارف گھر سے نکل کر باہر جاتا تو موچی بابا کو غور سے دیکھتا مگر وہ ہمیشہ اُسے اپنے کیبن میں بیٹھے دکھائی دیتے ۔ عارف کو یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ، اور وہ سوچتا : "تو آج بھی بابا یونہی بیٹھے ہیں ۔ آخر میں کب بابا کے احسان کا بدلہ چکاؤں گا ؟"

پھر یوں ہُوا کہ شہر میں فسادات ہو گئے ، ہر طرف خُون کی ہولی کھیلی جانے لگی ۔ بھائی بھائی کا گلا کاٹنے لگا ۔ سب اپنے خدا اور اپنے رسولؐ کے فرمان کو بُھول گئے ۔ خدا خدا کر کے دس پندرہ دنوں بعد فسادات بند ہوئے ۔ اب شہر دوبارہ پُرسکون ہو چلا تھا ۔ موچی بابا فسادات کے دوران کہیں اور چلے گئے تھے مگر اب وہ پھر لوٹ آئے تھے ۔

ایک دن عارف اپنے بڑے بھائی کے ساتھ جُوتے خریدنے بازار جا رہا تھا کہ اُس نے دیکھا کہ گلی کے نکڑ پہ بھیڑ جمع ہے ۔ عارف کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا ۔ وہ اپنے بڑے بھائی کا ہاتھ پکڑے بھیڑ کو چیرتا ہُوا آگے بڑھا تو اُس نے دیکھا کہ موچی بابا خون میں لت پت زمین پہ پڑے ہیں ۔ لوگوں کی گفتگو سے معلوم ہو رہا تھا کہ کوئی گاڑی والا انھیں ٹکّر مار کر گزر گیا ہے ۔

"بھائی جان ! بھائی جان یہ تو وہی بابا جی ہیں جو مجھے اُٹھا کر اسپتال لے گئے تھے ۔ آپ پلیز انھیں اُٹھا کر اسپتال لے چلیے ۔" عارف نے بے تابی کے ساتھ اپنے بڑے بھائی سے کہا ۔

"نہیں" بھائی صاحب نے صاف لہجے میں کہا ۔ وہ مسلسل موچی بابا کی جیب سے نکل کر گر جانے والی نسوار کی تھیلی کو گھور رہے تھے ۔ عارف کے دل میں آیا کہ وہ بھائی صاحب کے ساتھ کوئی گستاخی کرے مگر اس سے قبل کہ وہ کچھ کرتا اُس کے بھائی صاحب اُس کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھ گئے ۔ عارف کی آنکھیں آنسوؤں سے اور جسم پسینے سے بھیگ گیا ۔

عارف اس واقعے کے بعد کئی روز تک اس طرح خاموش رہا ، جیسے اُسے بولنا ہی نہ آتا ہو ۔ عارف کا دل چاہتا کہ وہ اسپتال جا کر موچی بابا کو دیکھ کر آئے ۔ مگر اُسے اسپتال کا راستہ معلوم نہ تھا ۔ دو ماہ کی طویل مدت کے بعد موچی بابا صحت مند ہو کر دوبارہ اپنے کیبن میں لوٹ آئے ۔ عارف کو اُن کے لوٹ آنے کی اتنی خوشی ہوئی کہ اس نے اُس روز اسکول کی چھٹی کر لی ۔ وہ دوپہر تک موچی بابا کے پاس بیٹھا گفتگو کرتا رہا ۔ پھر وہ اُٹھ کر گھر چلا آیا ۔

رات کو عارف بستر پہ لیٹا تو اُسے بہت دیر تک نیند نہ آئی ۔ اُسے بار بار یہ محسوس ہوتا رہا کہ جیسے کوئی اہم کام ہونے سے رہ گیا ہے ۔ پھر اُسے نیند آ گئی ۔ اب عارف جب بھی رات کو سونے کے لئے لیٹتا اُسے لگتا کہ جیسے وہ کوئی اہم کام جو کہ اُسے کرنا تھا نہیں کر سکا ۔

ایک روز وہ شام کے وقت دہی لینے بازار جا رہا تھا جیسے ہی وہ سڑک پہ مُڑا اُس نے دیکھا کہ سامنے لوگوں کی بھیڑ لگی ہے ۔ وہ دوڑتا ہوا وہاں گیا تو اُس نے دیکھا کہ ایک شخص دوسری طرف کروٹ لئے زمین پہ پڑا ہے ۔ لوگوں کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ اُس کا ایکسیڈنٹ ہوا ہے ۔ پیٹھ کی طرف سے وہ شخص موچی بابا کی طرح کا لگ رہا تھا ۔ عارف کا دل خوشی سے دھڑکنے لگا ۔ اللہ نے اُسے موچی بابا کے احسان کا بدلہ اُتارنے کا موقع دے دیا تھا ۔ شاید اسی لئے اُس کے بڑے بھائی بھی اُس کے ساتھ نہیں تھے ۔ عارف تیزی کے ساتھ دوسری طرف گیا تاکہ سڑک پہ پڑے ہوئے آدمی کا چہرہ دیکھ سکے ۔ جیسے ہی وہ دوسری طرف گیا ، اس کے چہرے پہ مایوسی چھا گئی ۔ وہ کوئی اور شخص تھا ۔ عارف اُداس قدموں کے ساتھ دہی کی دکان کی طرف روانہ ہو گیا ۔ مگر اُس کے ذہن

میں ایک خیال بار بار آرہا تھا۔ کاش موچی بابا ایک بار پھر حادثے کا شکار ہو جائیں تاکہ وہ اُن کے احسان کا بدلہ چکا سکے۔ اس کے بعد یہ خیال عارف کے ذہن سے چپک کر رہ گیا۔ عارف کو معلوم تھا اگر اُس نے اپنا یہ خیال موچی بابا کو بتا دیا تو وہ اس سے کبھی بات نہیں کریں گے۔ حالانکہ وہ موچی بابا کو سب لوگوں سے زیادہ چاہتا ہے۔ اپنے امی ابو سے بھی زیادہ۔

بیکٹیریا

محمد عثمان، کراچی

بیکٹیریا کے نام سے آپ سب بہت اچھی طرح واقف ہیں یہ بہت چھوٹے ہوتے ہیں اور خورد بین کی مدد کے بغیر نہیں دیکھے جا سکتے۔ یہ تو آپ کو پتا ہی ہے کہ خوردبین چھوٹی چیزوں کو اپنی اصل جسامت سے کئی گنا بڑا کرکے دکھاتی ہے۔

بیکٹیریا کے بارے میں جاننے کی سب سے زیادہ کوشش مشہور سائنس دان پاسچر لوئی پاسچر نے کی جو ۱۸۲۲ء میں پیدا ہوا تھا سب سے پہلے سائنسدانوں جنہوں نے بیکٹیریا کا گہرا مطالعہ کیا وہ بیکٹیریا انسان کے لیے ضرر رساں تھے۔ ان میں سے کئی بیکٹیریا مختلف بیماریوں کی وجہ تھے۔ یہ ہمارے جسم میں بھی موجود ہوتے ہیں۔ اگر آپ ان بیکٹیریا کو خردبین کی مدد سے دیکھیں گے تو آپ کو پتا چلے گا کہ یہ جاندار ہیں یہ حرکت کرتے ہیں ان کی دُمیں بھی ہیں اور یہ تیر بھی سکتے ہیں۔ یہ بہت تیز حرکت کرتے ہیں اور اتنی تیز حرکت کرتے ہیں کہ آپ ان کی حرکت کا اندازہ بھی نہیں لگا سکتے ہیں۔ مختلف بیکٹیریا کی مختلف شکلیں ہوتی ہیں اُن کی حرکت اور عادات بھی مختلف ہوتی ہیں۔ ان ہی مختلف شکل وصورت اور مختلف عادات کی وجہ سے سائنسدان مختلف بیماریوں کا پتا چلا لیتے ہیں۔

بیکٹیریا کی تعداد میں اضافہ ہونے کا عمل بھی بہت دلچسپ ہے۔ اگر آپ انہیں خوردبین میں دیکھیں تو آپ کو بہت دلچسپ تبدیلی نظر آئے گی۔ آپ دیکھیں گے کہ ایک بیکٹیریم درمیان میں سے دو حصوں میں منقسم ہو جاتا ہے اور اس طرح ایک بیکٹیریا سے دو مکمل بیکٹیریا بن جاتے ہیں اور اس طرح ایک بیکٹیریم سے دو، چار آٹھ، سولہ اور بتیس اور یوں ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

اگر بیکٹیریا کو مناسب حالات یعنی مناسب خوراک اور مناسب حرارت میسّر آجائے تو ان کی تعداد میں بڑی تیزی سے اضافہ ہوتا ہے۔

اگر ہیضہ CHOLERA کے بیکٹیریا خوردبین کے ذریعے دیکھیں جائیں تو پتا چلے گا کہ ہر بیکٹیریم آدھے گھنٹے بعد دو بیکٹیریوں میں منقسم ہو جاتا ہے نہ صرف یہ کہ ان کی تعداد میں بہت تیزی سے اضافہ ہوتا ہے بلکہ یہ اتنے چھوٹے ہوتے ہیں کہ صرف دودھ کے ایک قطرے میں ہزاروں بیکٹیریا ہوتے ہیں ---

لیکن ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ جب بیکٹیریا کے لیے زندہ رہنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اور جب ان کے

لیے زندہ رہنا مشکل ہوجاتا ہے تو یہ زندہ رہنے کے لیے دوسرا طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ جب ان کے لیے زندہ رہنا مشکل ہوجاتا ہے تو مادہ بیکٹیریم اپنے اندر اسپور بنالیتی ہے باقی حصہ مُردہ ہوجاتا ہے۔ لیکن اسپورز ہوا میں اُڑتے پھرتے ہیں اور زندہ رہتے ہیں چونکہ یہ بہت ہلکے ہیں اسی لیے ہَوا کی مدد سے اُڑ کر کسی چیز پر جا گرتے ہیں۔ اور مناسب حالات میسّر آنے پر دوبارہ اُگنا شروع کردیتے ہیں۔

اسپورز ان جراثیم کو کہتے ہیں جن سے بغیر پھول والے پودے اُگتے ہیں۔

ننھّے شکاری

مرسلہ :- محمد عاقل احمد خان، پرانا سکھر

اِک جھیل کے کنارے
دو بچے پیارے پیارے
آئے شکار کرنے !
مچھلی پہ وار کرنے
ننھّے نے ڈالا کانٹا !
جھٹ پٹ نکالا کانٹا
ننھّی خوشی سے بولی
وہ دیکھو ایک مچھلی
کیا جگمگا رہی ہے
اس سمت آرہی ہے
مچھلی بھی تھی سیانی

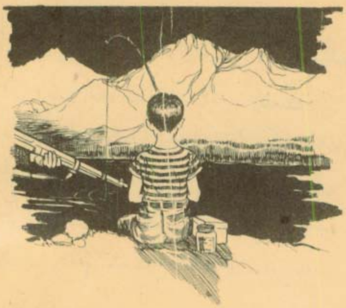

یہ بات اُس نے جانی
لالچ اگر کرے گی
بے موت ہی مرے گی
جلدی سے ایک غوطہ
مچھلی نے جو لگایا
ننھّے شکاریوں کو !
کیا خوب لُطف آیا

لازوال زندگی ___ شاندار موت

از محمد عمران نامعلوم

تُرکی کے مشہور مجاہد اور غازی انور پاشا جب اپنے مُلک سے دُور ترکستان میں اللہ کی راہ میں جہاد کر رہے تھے تو اپنی بیوی کو ایک خط میں لکھا۔

" انور کی سب سے بڑی آرزو یہ ہے کہ شہید ہوجائے اور حضرت خالد بن ولید کے ساتھ اس کا حشر ہو۔ دُنیا چند روزہ ہے۔ موت یقینی ہے پھر موت سے ڈرنا کیسا؟ جب موت آنے ہی والی ہے

تو پھر آدمی بستر پر پڑے پڑے کیوں مرے؟ شہادت کی موت، موت نہیں ہے، زندگی ہے۔ لازوال زندگی۔ میری وصیّت یہ ہے کہ تمہاری جتنی بھی اولاد ہو سب کو میری زندگی کے حالات سُنانا اور سب کو میدانِ جہاد میں اسلام اور وطن کی خدمت کے لیے بھیج دینا۔"

شہید کی موت، قوم کی حیات اور شہید کا لہو قوم کی زکوٰۃ ہے۔ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کا اقرار کرنے کے بعد وہ اپنی زندگی اللّٰہ تعالیٰ کی راہ میں وقف کر دیتا ہے۔ ایک مسلمان کی زندگی، مشکلات اور مصائب سے پُر ہوتی ہے۔ راہِ خدا میں اُسے گھر بار اور عزیز و اقارب کو چھوڑنا پڑتا ہے۔ اپنے کندھے اکھڑوانے پڑتے ہیں۔ اپنے جسم کو آرے سے چِروانے کے لیے تیار کرنا پڑتا ہے۔ اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے عزیز و اقارب کو خون میں لت پت دیکھنا پڑتا ہے اور اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنا پڑتا ہے۔

نادیدہ دشمن

کاشف عزیز۔ نارتھ ناظم آباد، کراچی

دوسری جنگِ عظیم میں جرمنوں کی شکست کی وجہ اُن کی نااہلی اور خودسری تھی۔ وہ جنگی معاملات میں تو اتحادیوں سے آگے تھے لیکن سیاسیات، اقتصادیات اور طِب وغیرہ کے شعبوں میں اتحادیوں سے پیچھے تھے۔ آج میں آپ کو جو واقعہ سُنا رہا ہوں وہ دوسری جنگِ عظیم ہی کا ہے۔

"کروِن ہرنز ولی ہیلم" نے ۱۴ر مارچ ۱۹۴۲ء کو جرمنی کی بندرگاہ چھوڑ دی۔ یہ جرمنی کا سب سے بڑا، سب سے تیز رفتار اور سب سے خطرناک جنگی جہاز تھا۔ جب اس جہاز کو بہاماس کے قریب چھوڑا گیا تو اس کا ہر حصّہ کوئلے اسلحہ اور اشیاءِ خورد و نوش سے بھرا پڑا تھا۔ اس جہاز کا مقصد بہاماس کے قریب سے گزرنے والے اور فرانس و بیلجیئم کی طرف سے آنے والے تمام جہازوں کو تباہ کرنا تھا تاکہ بہاماس تک کسی قسم کی رسد نہ پہنچ سکے۔ اس مقصد کے لیے جہاز نیم دائرے میں گشت کر رہا تھا۔

پہلے ہی دن اُس نے ایک چھوٹی لانچ کو تباہ کر دیا جو فرانس سے بہاماس سے تازہ گوشت لا رہی تھی۔ یہ گوشت چھ ماہ تک جہاز کے ہر فرد کے لیے کافی تھا۔ اس کے بعد ولی ہیلم نے بیلجیئم کی ایک بوٹ اور فرانس کے دو جہاز غرق کئے جن سے کوئلہ، اسلحہ، کیک، بسکٹ اور شراب حاصل ہوئی۔

دو ماہ بعد ولی ہیلم نے تین جہاز اور غرق کر دیئے۔ بندرگاہ چھوڑنے کے چھ ماہ بعد ولی ہیلم تقریباً چھ جہاز چار بوٹس ایک لانچ اور دس جنگی بوٹس غرق کر چکا تھا اور لاکھوں ٹن اشیاء کے خورد و نوش حاصل کر چکا تھا۔

کھانے پینے کی فراوانی اور کوئی کام نہ ہونے کے سبب جہاز کے ملّاح اور آفیسر کاہل اور سُست ہو گئے تھے۔ انھیں یقین تھا کہ کوئی اُن کے جہاز کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ کیونکہ چھ ماہ کے دوران ولی ہیلم پر ہلکی سی خراش بھی نہیں آئی تھی۔

۱۹۴۳ء کے اوائل میں ولی ہیلم نے ایک نارویجن اور ایک برطانوی لانچ کو غرقاب کر دیا۔ دونوں لانچوں میں بالترتیب تین ہزار اور پچاس ہزار پاؤنڈ گندم تھی۔ جرمنوں نے گندم کو یہ کہہ کر سمندر میں پھینک دیا کہ یہ کتوں اور گھوڑوں کی غذا ہے۔

اس دوران جرمنی نے پولینڈ، بیلجیم، ناروے اور
چیکوسلواکیہ پر قبضہ کر لیا۔ اس لیے ولی ہیلم کو گوشت کے
لیے بحیرۂ احمر کی طرف بھیج دیا گیا۔

یہاں اتحادیوں کی طرف سے حملے کا کوئی خطرہ نہ تھا
اس لیے جرمنوں نے ایک دفعہ لنگر ڈال دیا اور عیش کرنے
لگے۔ لیکن یہاں پر یکایک آہستہ آہستہ جرمن ملاح مرنے
لگے۔ اُن کی ہڈیاں اکڑ جاتیں۔ سانس لینے میں تکلیف ہونے
لگتی، جسم کام کرنا چھوڑ دیتا، دل پر دباؤ بڑھ جاتا اور موت
واقع ہو جاتی۔ ایک ہفتے میں اڑھائی سو افراد مر گئے۔
بقیہ پانچ سو کی حالت بھی بے حد خراب تھی۔ کپتان نے
یہ حالت دیکھ کر جزیرہ ہوائی کے غیر جانبدار پورٹ پر قیام
کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہاں دس روز کے قیام کے دوران مزید
تین سو نفوس مر گئے وہاں کی انتظامیہ اس حال سے بہت
پریشان ہوئی۔ وہ سمجھی کہ طاعون پھیل گیا ہے۔ جزیرہ
بھر کے ماہرین بُلائے گئے اور سب نے ایڑی چوٹی کا
زور لگا دیا مگر کوئی آفاقہ نہ ہُوا۔ آخر کار ایک دن ایک صحافی
سر الفریڈ میک کین نے اس بیماری کا حل دریافت کر لیا۔
وہ صحافی کے علاوہ ایک ماہرِ طِب اور ماہرِ نفسیات بھی تھا۔

اُن کا طریقۂ علاج بے حد مختلف تھا۔ وہ مریضوں
کو آلو کے چھلکے کا سوپ، گندم کی بالیاں، گوبھی، جڑوں
والی سبزیاں انڈے کی زردی اور پھل وغیرہ کھلانے لگے۔
ہفتے بھر میں باقی ماندہ تمام قیدی چلنے پھرنے کے قابل
ہو گئے۔ اور مہینے بھر میں بالکل صحت مند ہو گئے۔

سر الفریڈ نے جو چیزیں جرمنوں کو کھلائی تھیں۔
اُن میں وٹامن بی۔ ا شامل تھی۔ جرمنوں نے ۵۳، ہزار
پاؤنڈ گندم کو کتوں اور گھوڑوں کی غذا کہہ کر غرق کر دیا تھا
اُسی کتوں اور گھوڑوں کی غذا کی وجہ سے جرمن وٹامن بی۔ ا
کی کمی کا شکار ہو گئے۔ جس کی وجہ سے اُن میں ایک وائرس
"بیری بیری" پیدا ہو گیا جو اُن کے جسموں کو کھوکھلا
کرنے لگا۔

اسی نادیدہ دشمن کی وجہ سے کرون پرنز ولی ہیلم کو
اپنے ساڑھے چھ سو افراد سے ہاتھ دھونا پڑا۔ کہا جاتا ہے
کہ ولی ہیلم کے سپاہیوں میں پھیلنے والی یہ بیماری جرمنی
کی شکست کا ایک اہم سبب بنی۔

دیس کی قسمت

محمد اعجاز خان بابر۔ جامشورو

ہم بچّے ہیں دیس کی قسمت
اچھی پڑھائی، اچھی صحت
اچھی غذا کی ہم کو ضرورت
یہ نعرہ ہے ایک حقیقت
ہم بچّے ہیں دیس کی قسمت

ہم کو کھلاؤ دُودھ ملائی
پھر تو ہوگی خوب پڑھائی
اور کریں گے دِل سے محنت
ہم بچّے ہیں دیس کی قسمت

آج کے بچّے کل کے جواں ہیں
آگے بڑھیں تو سیل رواں ہیں
ہم سے وطن کی شانِ وعظمت
ہم بچّے ہیں دیس کی قسمت

چراغ تلے

مرسلہ: سحر ناز ۔ چوہنگ لاہور

آئینے کے سامنے کھڑا تجمّل تقریر کی تیاری کر رہا تھا۔ تجمّل اسکول کا ایک اچھا مقرر تھا اور وہ کئی مقابلوں میں بہترین مقرر ہونے کا اعزاز حاصل کر چکا تھا

اُس نے اپنا عکس آئینے میں دیکھا تو وہ دھیرے سے مُسکرا دیا اور سوچنے لگا۔

"اوّل انعام میرا ہی ہوگا پھر لوگ تالیاں بجا رہے ہوں گے۔ اور مہمانِ خصوصی مجھے انعام دے رہے ہوں گے اور تصاویر اُتاری جا رہی ہوں گی۔" یہ سوچ کر ایک بار پھر وہ مُسکرا اُٹھا، اُس نے تقریر والا کاغذ تہہ کر کے جیب میں رکھا۔ اسکول میں سالانہ انعامی تقریری مقابلہ منعقد ہو رہا تھا۔ تقریر کا موضوع تھا۔

کرو مہربانی تم اہلِ زمیں پر

تجمّل اپنے کمرے سے باہر نکل آیا۔

تجمل باورچی خانے کی طرف بڑھا۔ جہاں اُس کی امّی ناشتہ تیار کر رہی تھی۔ اُس نے سادہ سا ناشتہ کیا اور امّی سے بولا۔

"امّی جان! اب مجھے اسکول جانا چاہیے۔"

"اچھا بیٹا۔ اللہ تعالیٰ تمہیں آج پھر کامیابی و کامرانی سے نوازے۔" اُس کی امّی نے اجازت دیتے

نقل شدہ، طویل اور غیر معیاری تحریریں شائع نہ ہوسکیں گی۔

بے وقوف ہرن

آصف اقبال ۔ ناظم آباد کراچی

ایک دفعہ کا ذکر ہے ایک ہرن ایک تالاب میں پانی پی رہا تھا۔ اچانک اس کی نظر پانی میں موجود اپنے عکس پر پڑی ہرن نے پانی میں اپنے سینگوں کو دیکھ کر خوشی سے کہا۔

"واہ میرے سینگ کتنے خوبصورت ہیں، لیکن میری دُبلی پتلی ٹانگیں میری خوبصورتی کو متاثر کرتی ہیں

ہرن ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک دو شکاری کُتّے ہرن کے پیچھے لگ گئے۔ ہرن گھبرا کر تیزی سے بھاگا۔ شکاری کتے مسلسل ہرن کے تعاقب میں تھے۔ اچانک دوڑتے ہوئے ہرن کے سینگ جھاڑیوں میں پھنس گئے، ہرن نے بہت کوشش کی لیکن سینگ نکلنے کے بجائے ٹوٹ گئے ہرن بھاگتا ہوا درختوں کے جھُنڈ میں غائب ہوگیا اور شکاری کتوں سے جان بچائی، لیکن بعد میں جب ہرن نے اپنا عکس پانی میں دیکھا تو پچھتایا۔ سینگ ٹوٹنے کی وجہ سے اُس کی شکل نہایت بدصورت لگ رہی تھی۔ ہرن نے اپنی بے وقوفی پر افسوس کرتے ہوئے کہا۔

"کاش! میں اُس وقت غرور نہ کرتا۔ واقعی ٹانگوں کے بغیر کچھ نہیں ہوتا۔" سچ ہے۔

"ہر چمکنے والی چیز سونا نہیں ہوتی۔"

(انگریزی سے ترجمہ)

ہوئے کہا۔

"خداحافظ" اُس نے اپنی جگہ سے اُٹھتے ہوئے جواب دیا

"اور ہاں، بیٹے، ذرا آہستہ سائیکل چلایا کرو۔ تمہارے ابّو ناراض ہو رہے تھے کہ تم تیز رفتاری سے سائیکل چلاتے ہو" اُس کی امّی نے اُسے سمجھایا

"جی، بہت اچھا" تجمّل نے اثبات میں سر ہلایا

لوگ سڑک کے کنارے بس کے انتظار میں کھڑے تھے۔ بچّے سفید وردی پہنے اور کاندھے پر بستہ ڈالے اسکول جا رہے تھے۔

تجمّل نے امّی کے سامنے تو آہستہ سائیکل چلانے کا وعدہ کر لیا تھا۔ لیکن اب اُس نے سائیکل کے پیڈل زور زور سے چلانے شروع کر دیے۔ اُس کی سائیکل سپاٹے بھرتی سڑک پر دوڑتی جا رہی تھی۔

اچانک موڑ کاٹتے ہوئے سامنے سے ایک ضعیف العمر آدمی جو کہ ایک بچّے کو اسکول چھوڑنے جا رہا تھا۔ سائیکل کی زد میں آ گیا۔ سائیکل کی زور دار ٹکّر اُسے لگی اور وہ سڑک پر گر پڑا۔ تجمّل بھی گر پڑا۔

یہ صورتِ حال دیکھ کر وہ پریشان ہو گیا اور سوچنے لگا کہ اب کیا کیا جائے؟ اُس نے فوراً اپنی سائیکل سنبھالی اور اُس پر سوار ہو گیا۔ پھر اُس نے یہ سوچ کر سائیکل آگے بڑھالی کہ اس آدمی کو اسپتال لے کر گیا تو کافی وقت ہو جائے گا اور ہو سکتا ہے

مجھے تھانے بھی جانا پڑے۔ اگر اسی دوران تقریری مقابلہ ہو گیا تو...

اس سے بہتر ہے کہ ابّو کو فون کر دوں گا وہ خود اس معاملے سے نبٹ لیں گے۔

اُدھر جب لوگوں نے آدمی کی چیخ پکار سُنی تو تیزی سے اُس کی مدد کو دوڑے۔ تھوڑی دیر میں جائے حادثہ پر ایک مجمع ہو گیا اور لوگ اُسے سنبھالنے لگے اور اسپتال لے کر چلے گئے۔

جب تجمّل اسکول پہنچا تو اُسے معلوم ہُوا کہ مہمانِ خصوصی بعض ناگزیر وجوہات کی بنا پر آج نہیں آسکتے اس لیے مقابلہ کل پر ملتوی کر دیا گیا ہے۔

کچھ سوچ کر اُس نے اپنی جیب سے تقریر نکالی اور کاغذ کو کھول کر دیکھنے لگا۔ اُسے ایسے لگا جیسے تقریر کے الفاظ اُس کا مذاق اُڑا رہے ہوں اور کہہ رہے ہوں۔

"...تمہیں تو اندھوں اور بے سہاروں کا سہارا بننا تھا..."

"تم تو دوسروں کے لیے نیکی کا پیغام لے کر آئے تھے، دوسروں کے لیے روشنی لے کر آئے تھے... اور خود..."

صدور کی تاریخِ پیدائش

ساجد کمالوی، کمالیہ

برازیل کے صدر فگوریڈو ۱۵ جنوری ۱۹۱۸ء کو پیدا ہوئے
گنی کے صدر احمد سکوطورے ۱۹ جنوری ۱۹۲۲ء کو پیدا ہوئے
رومانیہ کے صدر چاؤشسکو ۲۶ جنوری ۱۹۱۸ء کو پیدا ہوئے
امریکہ کے صدر رونالڈ ریگن ۶ فروری ۱۹۱۱ء کو پیدا ہوئے
زمبیا کے صدر کینیتھ کاؤنڈا ۲۸ اپریل ۱۹۲۴ء کو پیدا ہوئے
گیمبیا کے صدر ڈاؤدا جوارا ۱۶ مئی ۱۹۲۴ء کو پیدا ہوئے
آسٹریا کے صدر کرک شیکر ۲۰ مئی ۱۹۱۵ء کو پیدا ہوئے
انڈونیشیا کے صدر جنرل سہارتو ۸ جون ۱۹۲۱ء کو پیدا ہوئے
میکسیکو کے صدر پورٹیو ۱۶ جون ۱۹۲۰ء کو پیدا ہوئے
لبنان کے صدر الیاس سارکس ۲۰ جولائی ۱۹۲۴ء کو پیدا ہوئے
کیوبا کے صدر فیڈل کاسترو ۱۳ اگست ۱۹۲۶ء کو پیدا ہوئے
کیمرون کے صدر آہد جو احمدو ۲۴ اگست ۱۹۲۴ء کو پیدا ہوئے
بنین کے صدر احمد کریکو ۲ ستمبر ۱۹۳۳ء کو پیدا ہوئے
فن لینڈ کے صدر کیکونن ۳ ستمبر ۱۹۰۰ء کو پیدا ہوئے
فلپائن کے صدر مارکوس ۱۱ ستمبر ۱۹۱۷ء کو پیدا ہوئے
فرانس کے صدر متراں ۲۶ اکتوبر ۱۹۱۶ء کو پیدا ہوئے
قبرص کے صدر کپریانو ۲۸ اکتوبر ۱۹۳۳ء کو پیدا ہوئے
چلی کے صدر پنوچٹ اگارٹ ۴ نومبر ۱۹۱۵ء کو پیدا ہوئے
روس کے صدر برژنیف ۱۹ دسمبر ۱۹۰۶ء کو پیدا ہوئے
بوٹسوانا کے صدر لوکاس مینگوپ ۲ دسمبر ۱۹۲۷ء کو پیدا ہوئے

روتا ہُوا مینار

حافظ عبدالماجد بلوچ، بلوچستان

ترکی کی ایک مسجد میں ایک ایسا مینار موجود ہے۔ جس کی چوٹی سے گھنٹوں پانی کے قطرے گرتے رہتے ہیں۔ وہاں کے آدھے لوگ اس مینار کا پانی اپنے گھر لے جاتے ہیں۔ پانچ صدیوں سے یہ پانی مسلسل گر رہا ہے، لیکن اس مینار کا راز کسی کو اب تک معلوم نہیں۔

بلیک بکس

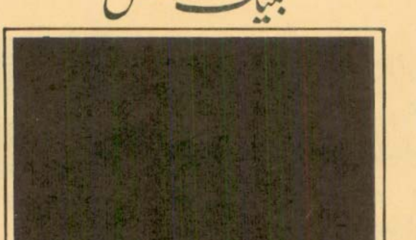

"اگر آپ مستقبل کے اچھے اور نیک نام ادیب بننا چاہتے ہیں تو کوشش کیجیے کہ آپ کا نام بلیک بکس میں نہ آنے پائے۔"

سالگرہ کے ساتھی

دسمبر میں پیدا ہونے والے ساتھیوں کا تعارف

عبد العلی شیخ ، ششم
یکم دسمبر ۱۹۷۳ء
آنکھ مچولی پڑھنا، سائنس
پائیلٹ بننے کا ارادہ ہے چک نمبر ۲
تحصیل گولارچی ضلع بدین

ذیشان بوفاضلانی، ہشتم
یکم دسمبر ۱۹۷۵ء
کرکٹ کھیلنا، انگلش
انجنیئر - اے گیارہ فیز ۲ ایجنسی اپارٹمنٹ
گلشن اقبال کراچی

عاصم ظفر صدیقی ، دہم
یکم دسمبر ۱۹۷۱ء
کرکٹ کھیلنا ، آنکھ مچولی
پڑھنا ، سائنس ، انجینئر۔
نزد ڈاکخانہ جنگ شاہی ضلع ٹھٹھہ

شاہد ندیم ، ہفتم بی
۲ ر دسمبر ۱۹۷۶ء
کرکٹ ، معاشرتی علوم
ڈاکٹر بنا چاہتے ہیں ۔ کاکشان یعقوب خان
کوارٹر نمبر ۷

مرزا فرخ بیگ ، نہم
۹ ر دسمبر ۱۹۷۵ء
مارشل آرٹ کھیلنا، حساب
انجینئر بنیں گے - آر سی ۲۷ گلشنِ اصغر
کراچی ایئرپورٹ کراچی

محمد علی ، دہم
۱۰ ر دسمبر ۱۹۷۰ء
قلمی دوستی کرنا، انگریزی
نیوی آفیسر بنیں گے ۔ عمار یاسر سوسائٹی
ماموں کریانہ اسٹور مکان نمبر ۵۳ سروے نمبر ۲۲۴ کراچی

شاہد اقبال تبسم، نہم سی
یکم دسمبر ۱۹۷۴ء
ہاکی کھیلنا، مطالعہ کرنا
اسلامیات، پنجابی، ملک و قوم کی خدمت
اکرم سیال توقیر گورنمنٹ گورونگ ہائی اسکول ننکانہ صاحب ضلع شیخوپورہ

محمد عبدہٗ، نہم بی
۲، دسمبر ۱۹۷۴ء
کرکٹ، رسائل، ویٹ لفٹنگ
فزکس اور کیمسٹری۔ ایئر فورس میں جانا چاہتا ہوں۔
پرنچیر محمد عباس مکان نمبر ۳۶ بلاک ڈی بلیو گلستان کالونی فیصل آباد

محمد علیم گوپانگ، پنجم
۱۹، دسمبر ۱۹۷۸ء
کرکٹ، قلمی دوستی، سائنس
ڈاکٹر بنیں گے۔ کوٹلہ شیر محمد تحصیل و ضلع راجن پور

محمد علی چغتائی۔ ہشتم
یکم دسمبر ۱۹۷۳ء
کرکٹ کھیلنا، آنکھ مچولی
پڑھنا، بزنس مین بننا چاہتا ہوں۔
بی ۱۳۹ اسٹاف ٹاؤن گوجرانوالہ نزد بیٹے برادرس کی کوٹھی

مصطفےٰ فضل، ہفتم اے
۴، دسمبر ۱۹۷۷ء
ٹکٹ جمع کرنا، اسلامیات
فوجی بننا چاہتے ہیں۔ ۳۰-۷-سی سیکٹر بی ۱۱ نارتھ کراچی۔ کراچی

نیاز احمد، ششم
۵، دسمبر ۱۹۸۲ء
کرکٹ کھیلنا، اُردو
سرجن بننا چاہتے ہیں۔ ڈسٹرکٹ کونسل پبلک اسکول تربت بلوچستان

خواجہ جمیل احمد، دہم
یکم دسمبر ۱۹۷۳ء
قلمی دوستی کرنا، ریاضی
انجینئر۔ شعیب سنز بک سیلرز اود دھیانہ بازار مینگورہ سوات

محمد کاشف، فسٹ ایئر
۵، دسمبر ۱۹۷۴ء
کنگ فو سیکھنا، فزکس
جی ڈی پائیلٹ ۷/۲۰ بی ون ایریا لیاقت آباد نزد نادر لائبریری کراچی

راحیل قریشی، ہفتم
۲۳، دسمبر ۱۹۷۷ء
ٹکٹ جمع کرنا، مطالعہ
اسلامیات، فوجی بنیں گے۔ ۱۹۶۵-۳۸/۱ای نزد سٹی پوسٹ آفس حیدرآباد

ایم اکمل شاکر بسنوی۔ ہفتم
یکم دسمبر ۱۹۷۳ء
شاعری، قلمی دوستی، اُردو
شاعر بننا چاہتا ہوں۔ مراد دھکان جنرل اسٹور گلشن روڈ پسنی بلوچستان

فرحان احمد، نہم
۶، دسمبر ۱۹۷۵ء
ٹکٹ جمع کرنا، انگلش
ڈاکٹر بنیں گے احمد الیکٹرونکس ایم اے جناح روڈ میرپورخاص سندھ

مبشر محمود، دہم
۲۵، دسمبر ۱۹۷۵ء
قلمی دوستی، مطالعہ کرنا۔
فزکس، کرکٹ کمنٹری سننا۔ ڈاکٹر۔ ۶۳/۱۴ ا ار جی ایریا، نیو کراچی، کراچی

آصف الرحمٰن، ہفتم
۲۵، دسمبر ۱۹۷۶ء
کرکٹ، آنکھ مچولی پڑھنا
انگلش، ڈاکٹر
ضلع و تحصیل کوہاٹ گاؤں ڈاکخانہ نصرت خیل

اظہر علی، ششم
۲۶، دسمبر ۱۹۷۶ء
قلمی دوستی، ہاکی کھیلنا
اردو، انگریزی، ڈاکٹر بنیں گے۔
شعیب سنز بک سیلرز اود دھیانہ بازار مینگورہ سوات

سید فرید حسین، ہفتم
۳۱، دسمبر ۱۹۷۷ء
ٹکٹ، سکے جمع کرنا،
اُردو، فوجی۔
۲۶ بی سپاہانی اسکوائر نارتھ ناظم آباد حیدری کراچی

یاور خیام، نہم
۲۵، دسمبر ۱۹۷۵ء
مطالعہ، مضامین لکھنا
مطالعۂ پاکستان، انجینئر بنیں گے۔
۱۵/۵۲، فیڈرل بی ایریا کراچی

نوٹ:- ساتھیوں سے گزارش ہے کہ کوپن کے ساتھ جو تصویر ارسال کریں اُس کا سائز ۱ ۱/۲ انچ ضرب ڈیڑھ انچ ہو۔

امّی ابّو کا صفحہ

اُمِّز رمیصاً

اکثر والدین ذرا ذرا سی بات پر بچّوں کو بُری طرح ڈانٹ دیتے ہیں اور بچّوں کا پھُول سا چہرہ اُن کے سخت لہجے کے باعث کمُلا سا جاتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ہمارے معاشرے میں ایسے امّی ابّو بھی لاتعداد ہیں جو معمولی باتوں پر بچّوں کو سخت سرزنش کرتے ہیں۔ اُنہیں مارنا، پیٹنا، دُھتکارنا، بد دُعائیں دینا اور لعنت ملامت کرتے رہنا اکثر والدین کا وطیرہ ہے۔ جو کسی المیے سے کم نہیں۔

ایسے سخت رو والدین شاید یہ سمجھتے ہیں کہ اُن کی اولاد ہے، ہی اس قابل یا یہ کہ یہ بھی تربیت کا ایک طریقہ ہے کہ اُنہیں اپنے رُعب میں رکھنے کے لئے کبھی کبھار سزا دی جاتی رہے۔ سچ پوچھئے تو بچّے اس قابل نہیں ہوتے کہ اُنہیں مارا پیٹا جائے۔ بلکہ جب والدین بچّے کو جسمانی اذیّت دے رہے ہوتے ہیں تو عین اُس وقت وہ خود کسی شدید ذہنی یا نفسیاتی دباؤ میں ہوتے ہیں۔ وہ اپنے غصّے کا اظہار کہیں اور نہیں کر پاتے تو بے چاری اس معصوم مخلوق کی دھنائی کر کے رکھ دیتے ہیں۔ اگر خدانخواستہ آپ بھی ایسے سخت مزاج والدین کی فہرست میں آتے ہیں تو ہمارا کہا مانئے اور اس لمحے جب آپ کو بچّوں پر غصّہ آ رہا ہو، اپنی کیفیت اور اُن حالات کا جائزہ لیجئے جس سے آپ گزر رہے ہوں۔ یقیناً درج ذیل وجوہات میں سے کوئی ایک وجہ آپ کے غصّے کا باعث ضرور ہوگی۔

۱ میاں بیوی کی ناچاقی ۲ مالی مسائل ۳ کسی ناکامی کا احساس ۴ باس کا غیر مناسب طرزِ عمل
۵ کام کا شدید دباؤ ۶ کوئی شدید احساسِ کمتری۔

اگر واقعی کوئی ایسی بات ہے تو پھر اپنی اصلاح کیجئے۔ اپنے بچّے کو بے وجہ کوئی سزا نہ دیجئے۔
اگر آپ کا بچّہ شرارتی ہے اور اس کی شرارت میں تخریب کا عنصر موجود نہیں ہے تب تو خاص طور پر یہ بچّہ سزا کا مستحق نہیں ہے اس لئے کہ آج کا شرارتی بچّہ... کل کا ذہین انسان ہے۔
یاد رکھئے۔ آپ کا غصّہ ... آپ کے بچّے سے اُس کی ذہانت چھین سکتا ہے۔

پاکیزہ، صحت بخش، لذیذ
احمد کے کھانے سب کو عزیز

آپ سفر میں ہوں، ملک سے باہر ہوں یا
گھر میں اچانک مہمان آجائیں
احمد کے پکے پکائے کھانوں کے
ڈبّوں کو صرف دس منٹ
گرم پانی میں رکھیں یا کھول کر گرم
کرلیں - لیجئے کھانا تیار

لذّت بھی - کفایت بھی

احمد کے پکے پکائے
کھانے

نہاری، شاہی حلیم، قورمہ، کوفتہ
آلو قیمہ، سرسوں کا ساگ

جدید ترین آٹومیٹک پلانٹ پر تیار کردہ
ہر دم تازہ، سیل بند ڈبّوں میں
دُنیا میں ہر جگہ دستیاب

احمد

ہمیں فخر ہے کہ ہماری مصنوعات
نے ساری دنیا میں پاکستانی ذائقوں
کو متعارف کرایا۔

MASS

REGD. NO. M–266 DECEMBER 1989

MONTHLY AANKH MICHOLLE KARACHI